

مرزا گیت

نئے زادوں پر سے

مولانا محمد حنفی ندوی

مرتب
محمد سرور طارق

طارق اکیدمی فیصل آباد

مزاییت

نئے زاویوں سے

مولانا محمد حنفی ندوی^ر

مقدمہ: مولانا محمد الحق بھٹی

مرتب: محمد سرور طارق

طارق آکیڈمی

ڈی گراؤنڈ (سموسہ چوک) فیصل آباد فون 546964

مزاییت

نئے زاویوں سے

مولانا محمد حنفی ندوی^ر

مقدمہ: مولانا محمد الحق بھٹی

مرتب: محمد سرور طارق

طارق آکیڈمی

ڈی گراؤنڈ (سموسہ چوک) فیصل آباد فون 546964

مزاییت

نئے زاویوں سے

مولانا محمد حنفی ندوی^ر

مقدمہ: مولانا محمد الحق بھٹی

مرتب: محمد سرور طارق

طارق آکیڈمی

ڈی گراؤنڈ (سموسہ چوک) فیصل آباد فون 546964

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
9	مولانا محمد خالد سیف حرف آغاز	1
13	مولانا محمد الحق بھٹی حرف چند	2
31	مولانا محمد حنفی ندوی ["] ابتدائیہ	3
36	مولانا محمد عفرا شاہ پھلواڑوی پیش لفظ	4
43	ختم نبوت اور اس کے حدود و اطلاق نئی بات کہنا مشکل ہے فلکرو استدلال کے تین اصول مناظر اندازہ نیت مرزاںی نقطہ نظر کا صحیح تجزیہ فلکرو استدلال کی عام لغرض	5
69	ختم نبوت، آیات و احادیث کے حقائق ایک حقیقت کا دانستہ اعتراف فنِ تفسیر کا اعجاز فقیہ اور موئرخ میں فرق	6

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
110	<p>جریانِ نبوت کے دلائل کی نوعیت کیا خاتم کے معنی افضل کے ہیں؟ نبوت و ولادت میں فرق اجراء نبوت پر کتنے آیات سے استدلال کیا جاسکتا ہے؟</p> <p>فیصلہ کن تنقیح</p> <p>ظہری نبوت کا تصور کیونکر پیدا ہوا؟ بابل میں نبوت کا تصور عیسائیت کیونکر پیدا ہوئی سائل کا فیصلہ کن انداز کوئی انسان معصوم نہیں عصمت ائمہ کا عقیدہ کیونکر؟ شیعیت، اسلام کے خلاف سازش ختم نبوت کا ایک ثابت عقیدہ</p>	<p>7</p>
137	<p>قادیانی الگ قوم فرقہ یا اقلیت کیا قادیانی الگ قوم ہیں؟ تاویلات کے مختلف مدارج یہ مناظرانہ انجمنیں چوہدری ظفر اللہ کا عارضی اقتدار آئندہ دستور میں مرزا یوسف کی جگہ مسکن ختم نبوت اور اقلیت</p>	<p>8</p>

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
154	<p>مذہب و ریاست کے موجودہ تقاضے اور نبوت نبوت و رسالت، جھوٹ اور سچ کا فرق ختم نبوت کے معنی نبوت و رسالت کا عام فہم معيار اللہ کا معيار انتخاب کیا یہ پیغمبر ہے؟ و مختلف دعوے (نبوت۔ تجدید) جھوٹانبی اور سچانبی پیشن گوئی کا پتھرہ</p>	9
201	<p>خلافتِ مرزا سیہ۔ (انتہائی اہم اور اصولی بحث)</p> <p>خلیفہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ خلیفہ کی شرعی حیثیت مرزا سیہ نکتہ نظر مرزا سیہ استدلال یا فریب کاری</p>	10
218	<p>سیاسی پس منظر، برٹش گورنمنٹ سے وفاداری مرزا سیہ کا سیاسی پس منظر پیغمبر اور حکومتِ باطلہ کی تائید مرزا سیہ کی مغدرت نبوت سے دست برداری</p>	11

مولانا ندوی کا اسلوب نگارش

مولانا کئی حیثیتوں سے اپنی تخلیقات میں سامنے آئے ہیں۔ وہ ایک محقق ہیں، شارح ہیں، مفسر ہیں، مترجم ہیں، نقاد ہیں اور مقدمہ نگار ہیں۔ اگر تم نظر سے ان کی فاضلانہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی اور حیثیتیں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وہ عالمِ دین ہیں، فلسفی ہیں، منطقی ہیں، اور موئخ بھی ہیں۔ ان میں سے ہر حیثیت ایک خاص اسلوب نگارش کی مقتضی ہے۔

مولانا کا اسلوب نگارش عام منظیقوں کی طرح خشک، بے کیف، بے رنگ نہیں بلکہ ان میں ادیباً نہ رنگ کی جھلک نمایاں محسوس کی جاتی ہے، ان کے ہاں دلائل آفرینی کے ساتھ ساتھ تخلیقی حسن و جمال بھی ہے۔

میں نے دینی علوم کے تین بڑے مفکروں کی تحریریں پڑھی ہیں۔ ان میں سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، دوسرے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور تیسرا مولانا محمد حنفی ندوی، میں ان کے اسالیب بیان کا جزیرہ اس طرح کرتا ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کا تصور کرتا ہوں تو میری نگاہوں کے سامنے ایک ایسی شوریدہ سر ندی آ جاتی ہے جو طوفانی رفتار سے بہتی ہوئی، راستے کے بڑے بڑے پھرروں سے نکراتی ہوئی اور انہیں بہاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اسلوب کی مثال ایک ایسی صاف، شفاف، آئینہ رنگ ندی کی ہے جو پھرروں سے پچتی ہوئی، دھیرے دھیرے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

مولانا حنفی ندوی کے اسلوب کو بھی ندی ہی کے توسط سے پیش کروں گا، مگر یہ ایک ایسی ندی ہے جونہ تو طوفانی رفتار سے بہتی ہے، نہ اس میں داخلی اور خارجی نوعیت کا جوش و خروش ہے یہ پھرروں سے نکراتی بھی نہیں، بلکہ ان سے الگ بھی نہیں ہوتی، بلکہ بڑی ملائمت سے انہیں اپنی گود میں لے کر چپ چاپ چلی جاتی ہے۔

(مرزا ادیب)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حُفَّ آنْجَار

اگرچہ انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند پر غاصبانہ قبضہ کرتے ہی اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلامی عقائد اور جذبہ جہاد کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں، لیکن انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو جو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، وہ اس شجرہ خبیثہ کی کاشت تھی، جسے مرزا نیت کہا جاتا ہے، اس کے لئے انہوں نے اپنے خاص دوست خاندان کے ایک فرد مرزا غلام احمد کو چن کر اس سے مسح موعود ہونے کا دعویٰ کرایا تاکہ وہ ذہنی و فکری پریشانی اور ضعف میں بنتاقوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کر سکیں۔ مرزا غلام احمد نے انگریزوں کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے یکے بعد دیگرے مجدد، مامور من اللہ، مثل مسیح، مسیح موعود اور بالآخر اپنے نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کر کے ملتِ اسلامیہ کو انتشار و خلفشار میں بنتا کر دیا اور عجیب بات یہ کہ ابھی تک اس نے اپنے مثل مسیح، مسیح موعود اور نبی و رسول ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا کہ بعض اہل اللہ نے اس کی تحریروں میں کفر والخاد کی یوسوگھ لی تھی۔ مثلاً اس کی کتاب ”براہین احمدیہ“ کے پہلے دو حصوں کی اشاعت تک بعض علمائے دین اگرچہ حسن ظن کی بنا پر مرزا صاحب سے مانوس تھے مگر بعض علماء ربانی اور اہل اللہ ایسے بھی تھے، جنہوں نے اسی کتاب سے مرزا صاحب کے کفر والخاد کی یوسوگھی اور اس خدشہ کا اظہار کیا کہ یہ شخص آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہے، ان

علماء ربانیین میں سے حضرت مولانا حافظ عبد المنان محدث وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ، امترس کے اہل حدیث علماء، غزنوی اکابر اور کچھ دیگر علماء کرام بھی تھے۔ حجۃ محمد اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا محمد حسین بیالوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ان علماء کرام میں سے تھے جو اس دور میں مرزا صاحب کے بارے میں حسن ظن رکھتے تھے لیکن جوں ہی مرزا صاحب نے کھل کر اپنی اصلیت کا اظہار کیا، تو سب سے پہلے حضرت مولانا محمد حسین بیالویؒ نے ہی مرزا صاحب کو کافر قرار دیا۔ اور یہ اعزاز بھی مولانا بیالویؒ ہی کو حاصل ہے کہ اسلام اور قادر یانیت کے مائن جو سب سے پہلا مناظرہ لا ہو رہا ہوا تھا، اس میں مسلمانوں کی طرف سے مناظر مولانا بیالویؒ تھے اور قادر یانیوں کی طرف سے حکیم نور الدین۔ مولانا بیالویؒ نے اس مناظرہ میں حکیم نور الدین کو ناکوں پختے چبوائے اور دلائل و برائیں کی طاقت سے اس طرح لا جواب کر دیا کہ حکیم نور الدین مناظرہ درمیان میں ہی چھوڑ کر لدھیانہ فرار ہو گیا، جہاں ان دنوں مرزا غلام احمد قیام پذیر تھا، بہر حال مولانا بیالویؒ نے ۱۸۹۱ء کو لدھیانہ میں مرزا صاحب کوتار ارسال کیا، جس میں تحریر تھا کہ آپ کا مرید خاص مناظرہ سے راہ فرار اختیار کر کے آپ کے پاس پہنچ چکا ہے، اسے مناظرے پر آمادہ کریں یا پھر خود مناظرہ کے لئے تیار ہو جائیں۔

جس طرح مولانا بیالویؒ نے اپنی زبان اور قلم سے مرزا صاحب کا تعاقب جائز رکھا، اسی طرح آپ کے استاد گرامی قدر شیخ الكل حضرت میاں سید نذری حسین محدث دہلوی نور اللہ فرنیک، حضرت مولانا عبد الحق غزنویؒ، پیر مہر علی شاہ، علماء لدھیانہ اور بعض دیگر سینکڑوں علماء کرام ہیں، جنہوں نے انگریزوں کے

کاشتے کئے ہوئے اس شجرہ خبیثہ کو نجخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، لیکن جو شہسوار اس میدان میں سب سے سبقت لے گیا اور مرزا نیت کے محابیے میں شہرت کی آخری حدود تک پہنچ گیا، انہیں دنیا فاتح قادیانی شیخ الاسلام حضرت مولانا شاء اللہ امر تری رحمہ اللہ کے اسم گرامی اور نامِ نامی سے یاد کرتی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنے آپ کو خدمتِ اسلام اور رِ مرزا نیت کے لئے وقف کئے رکھا، اس سلسلہ میں آپ کی گوناگون خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ان کے تذکرہ کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔

مرزا نیت کے احتساب کی تاریخ طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ بہر آئینہ اس سلسلہ میں ایک بہت ہی محترم نامِ مตکلمِ اسلام حضرت مولانا محمد حنف ندوی رحمہ اللہ کا بھی ہے، جن کی اس موضوع پر بہت ہی شاندار اور جاندار کتاب ”مرزا نیت نے زادیوں سے“، قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔ حضرت ندوی رحمہ اللہ کو اللہ ربِ ذوالجلال والا کرانے علم و فضل کی جس وسعت، فکر و نظر کی جس گہرائی، اسلوبِ نگارش کی جس رعنائی و زیبائی اور استدلال کی جس مکملی و استواری سے سرفراز فرمایا تھا، معاصر علماء میں دور دور تک آپ کا کوئی سہیم و شریک نہیں تھا۔ زیرنظر کتاب
مرزا نیت نے زادیوں سے آپ کے ان مقالات کا مجموعہ ہے، جو آپ کے دور ادارت میں ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور میں طبع ہوئے اور بعد میں ان میں سے کچھ ایک بار کتابی صورت میں بھی طبع ہوئے تھے۔

عزیز گرامی محمد سرور طارق ڈائریکٹر طارق اکیڈمی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اس علمی گنج گراں مایہ کوئی ترتیب دی اور مตکلمِ اسلام

حضرت مولانا محمد حنف ندوی رحمہ اللہ کے اس موضوع پر تمام قلمی شاہ پارے جو پہلے مجموعے میں نہ آ سکے انہیں اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سمجھی کو قبول فرمائے۔ برادر محترم خالد اشرف کا علمی ذوق اور مشورہ بھی ان کے معاون رہا۔

اس کتاب کے مقدمہ کے لئے ہم نے ایک ایسی شخصیت کو زحمت دی ہے۔ جنہیں مرکزی جمیعت اہل حدیث پاکستان میں، ہفت روزہ "الاعتصام" میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ میں، سفر میں، حضرت میں، خلوت میں اور جلوت میں، سالہا سال تک حضرت ندوی رحمہ اللہ کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے، امید ہے کہ اب قارئین کرام کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری مرادنا مور مفکروں و انشور صحافی و ادیب اور مترجم و مصنف حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ تعالیٰ سے ہے کہ ان سے بڑھ کر اور کوئی شخصیت اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے موزوں نہ تھی، ہم محترم مولانا بھٹی صاحب کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے بے حد وسیع مقدمہ لکھ کر حضرت مضاف کے حق رفاقت کو ادا کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں دنیا و آخرت کے حسنات و برکات سے نوازے، اسی طرح حضرت مضاف رحمہ اللہ کے لئے بھی ہم اللہ رب ذوالجلال والا کرام کے حضور دست بدعاہ ہیں کہ وہ آپ کے اس صدقہ جاریہ کو شرف قبولیت سے نوازے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ درجات سے سرفراز فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

محمد خالد سیف (نگران اعزازی)

طارق اکیڈمی

فیصل آباد

حروفِ حسن

مولانا محمد احقیقی

میسویں صدی کے نصف آخر میں برصغیر کے جن علمائے کرام نے علمی و تحقیقی خدمات سرانجام دیں، ان میں مولانا محمد حنفی ندوی کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ قرآن و حدیث، فلسفہ و حکمت اور ادب و انشاء میں ان کا مقام، بہت بلند تھا وہ صاف ذہن اور پختہ فکر عالم دین تھے۔ زبان کی چاشنی اور اظہارِ مدد عاکی دلکشی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

وہ 10 جون 1908ء کو گوجرانوالہ کے ایک محنت کش گھر انے میں پیدا ہوئے، پرانی تک سرکاری سکول میں تعلیم پائی۔ 1921ء میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ میں تشریف لائے اور انہوں نے درسِ قرآن اور خطبہ جمعہ کے ساتھ تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو محمد حنفی کے والد نور الدین نے بچے کو مولانا کے حلقة، تدریس میں شامل کر دیا۔ ذہن رسا پایا تھا اس لئے 1925ء (صرف چھ سال کے عرصے) میں مرودجہ درسِ نظامی کی تکمیل کر لی اور اسی سال مولانا محمد اسماعیل سلفی نے اپنے اس ہوبنہارشاگر کو مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔ ندوہ میں مولانا نے چار کام کیے۔

(1) مختلف علوم و فنون کی جوانہتائی کتابیں مولانا محمد اسماعیل سلفی سے گوجرانوالہ میں

پڑھی تھیں، ان میں سے بعض کتابیں وہاں ہر فن کے ماہراستاذ سے دوبارہ پڑھیں۔
 (2) قدیم و جدید عربی ادبیات کی خاص طور سے تحصیل کی اور اس کے لئے مشہور اساتذہ سے استفادہ کیا۔

(3) اٹھائی سال میں تفسیر قرآن میں درجہ تخصص کیا اور عربی کی تمام تفسیریں نہایت غور اور محنت سے پڑھیں۔

(4) اردو زبان سیکھنے اور اہل زبان کا ہبہ اپنانے میں بے حد کوشش کی۔
 پانچ سال 1925ء سے 1930ء تک وہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں تحصیل علم کرتے رہے اور ندوہ کے ذہین ترین طلباء میں گردانے لگئے۔ طلباء ان کا انتہائی احترام کرتے اور اساتذہ ان پر بے حد شفقت کا اظہار فرماتے تھے۔

ندوہ میں انہوں نے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن ٹوکی (وفات جون 1942ء) اور شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ (وفات فروردی 1944) سے خاص طور سے استفادہ کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک انتہائی عقیدت مندر فیض مولانا عبد الرحمن نگرامی (وفات 2 مارچ 1926) بھی ان دنوں ندوہ میں عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے تھے، محمد حنیف ندوی ان سے زیادہ استفادہ تو نہیں کر سکے، البتہ وہ ان کے عمل و کردار کی رفتاؤں سے بہت متاثر ہوئے۔

1930ء میں وہ ندوہ سے فارغ ہو کر گوجرانوالہ آگئے۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف کئی سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں اور برصغیر کے لوگ بالخصوص نوجوان انگریزوں سے شدید نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ پنجاب میں گوجرانوالہ کے باشندے انگریز کی مخالفت میں نہایت سرگرم تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بھی انگریزی اقتدار کی مخالفت میں تقریریں کیں اور گرفتار کر لئے گئے۔

گوجرانوالہ کی عدالت سے چھ مہینے کی قید ہوئی اور قصور جیل میں بھیج دیئے گئے۔ قید کی یہ دست قصور کی جیل میں پوری کی۔

قید سے رہائی کے بعد حضرت مولانا شاء اللہ امرتسری (وفات 15 مارچ 1948ء) کے مشورے سے مولانا محمد حنف ندوی کولاہور کی مسجد مبارک کا خطیب مقرر کر دیا گیا۔ اس مسجد میں وہ خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے اور مغرب کی نماز کے بعد روزانہ درس قرآن بھی دیتے تھے۔ تفسیر قرآن ان کی دلچسپیوں کا خاص محور تھا۔ انہوں نے 1930ء سے 1949ء تک اخخارہ انہیں برس یہ خدمت انجام دی اور بے شمار لوگ ان سے مستفید ہوئے۔

اب ان کی تحریری کاوشوں کی طرف آئے۔

جبیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، ندوہ میں مولانا نے قرآن سے متعلق تخصیص کیا تھا، پھر کم و بیش اخخارہ برس وہ مسجد مبارک میں درس قرآن دیتے رہے، خطبات جمعہ میں خطیب حضرات کوئی ایک خاص آیت تلاوت کر کے خطبہ دیتے ہیں، جس میں ترتیب کو لخونہیں رکھا جاتا لیکن مولانا نے بالترتیب آغاز قرآن سے چلایا جو تقریباً دو دفعہ اختتام کو پہنچا۔ یعنی شروع سے آخر تک دو قرآن انہوں نے صرف خطبات جمعہ میں ختم کئے۔ یہ ان کی قرآن سے بدرجہ غایت لگن اور محبت کی بہت بڑی دلیل ہے، بہت سے سامعین درس قرآن میں بھی ان کے بیان فرمودہ قرآنی نکات ضبط تحریر میں لاتے تھے اور خطبات جمعہ میں بھی۔

1934ء میں انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی سراج البیان کے نام سے کئی دفعہ چھپی۔ پہلے یہ تفسیر بڑے سائز کی دو جلدیوں میں ملک سراج الدین (تاجر کتب کشمیری بازار لاہور) نے شائع کی تھی، جو بار بار چھپی تھی، اب چند سال پیشتر یہ بہت

— مزائیت نے زاویوں سے

باریک خط میں چھوٹے سائز میں پانچ جلدوں میں شائع کی گئی ہے، جن کے پاس پہلی اشاعتوں کی بڑی تقطیع کی تفسیر موجود ہے، ان کا بیان ہے کہ موجودہ اشاعت میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں بلکہ سطروں کی سطربی غائب ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل لاہور میں پکیولمیڈٹ کا ایک ماہانہ رسالہ "حقیقت اسلام" کے نام سے شائع ہوتا تھا، قرآن کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مولانا ندوی کے اس میں بہت سے مضامین شائع ہوئے۔

"مطلوب القرآن فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے پکیولمیڈٹ (لاہور) نے قرآن مجید کے ترجمہ و حواشی کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو سید محمد شاہ ایم اے کے رشحات قلم کا نتیجہ تھا۔ مولانا نے اس پر نظر ثانی کی تھی، اس خدمت میں مولانا کے ساتھ مولانا شہاب الدین فاضل دیوبند اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی بھی شریک تھے۔

شرکت علمی لمبیڈٹ (لاہور) کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ "اسلامی زندگی" جاری کیا گیا تھا۔ یہ نام مولانا نے ہی تجویز کیا تھا، اس میں قرآن و حدیث کے بارے میں مختلف موضوعات پر مولانا کے بہت سے مضامین شائع ہوئے۔ اس کی ادارت کے فرائض بھی مولانا نے انجام دیئے تھے۔

ہفت روزہ "الاعتصام" کے متعدد شماروں میں "ایک آیت کی تفسیر" کے عنوان سے انہوں نے قرآن کی بہت سی آیات کی تفسیر لکھی، یہ سلسلہ کافی عرصہ تک چلا اور بے حد مقبول ہوا۔

15 مئی 1951ء کو وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے، وہاں انہوں نے قرآن سے متعلق "مطلوب القرآن" کے نام سے کتاب لکھی، جو بڑے بڑے سولہ عنوانات پر مشتمل ہے اور اس موضوع کی نہایت اہم کتاب ہے۔

قرآن کی توضیحی لغت کے بارے میں انہوں نے ”لسان القرآن“ کے نام سے حروف تہجی کو ترتیب سے لکھنا شروع کیا، سلسلہ حرف الف سے شروع ہو کر حرف دال (دیں) تک پہنچا تھا کہ مولانا وفات پا گئے۔ مطبوعہ مواد و جملوں کو محتوى ہے اور آنھ سو صفحات پر مشتمل ہے.....!

ان کی وفات کے بعد بہت سے اہل علم حضرات کے اصرار پر میں نے اسے حرف دال سے لکھنا شروع کیا، ساڑھے تیرہ صفحات کی ایک جلد حرف ”ف، ذ، حرف ”ر، اور حرف ”ز،“ کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جو علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور کی طرف سے معرض اشاعت میں آئی ہے۔ اب حرف میں سے کام ہو رہا ہے۔ اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ یہ سلسلہ مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن کام بہت مشکل ہے اور بہت وقت چاہتا ہے۔ اللہ ہی مد کرنے والا ہے۔

قرآن مجید کی طرح حدیث رسول ﷺ سے بھی مولانا کو بے حد تعلق خاطر تھا۔ انکار حدیث کو وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں لیکن خاتم النبیین ﷺ کی مخالفت اور انکار فراہمیں پیغمبر ﷺ کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب بھی کسی نے حدیث پاک کو حرف تقید ٹھہرایا، مولانا مقابلے میں آکھڑے ہوئے، اس ضمن میں انہوں نے ہفت روزہ ”الاعتصام“، سہ روزہ ”منہاج“ اور دیگر بہت سے رسائل و جرائد میں لکھا اور نہایت مدلل زور دار لکھا۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے اس موضوع پر ”مطالعہ حدیث“ کے نام سے نہایت اہم اور قابلِ قدر کتاب شائع ہوئی ہے۔

ان کی تصنیفی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع ہے، امام ابن تیمیہ کے حالات اور ان کی فلسفیانہ اور منطقیانہ تگ و تاز کے باب میں ”عقلیات ابن تیمیہ“، ان کی بہت

مشہور کتاب ہے، جو کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔

اسلام کے بنیادی پہلوؤں اور اساسی ارکان یعنی توحید اور نمازوں وغیرہ کی وضاحت و تبیین کے ضمن میں ”اسایات اسلام“ ان کی لائی تذکرہ کتاب ہے پھر ”مسئلہ اجتہاد“ ان کی وہ تصنیف ہے، جس نے تعلیم یافتہ حلقوں میں بڑی شہرت پائی کسی زمانے میں صحیح بخاری کے ترجمہ و تشریع کو بھی انہوں نے موضوع تحریر بنایا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے حدیث لکھی، پھر اس کا ترجمہ کیا، پھر سند کے راویوں کا ذکر کرو اور حدیث کی تشریع غالباً یہ سلسلہ پانچ پارے تک پہنچا تھا، افسوس ہے تکمیل نہ ہو سکا۔

ان کتابوں کے علاوہ ”افکار غزالی“، ”تعلیمات غزالی“ اور ”افکار ابن خلدون“ ان کی معزکہ آراء تصانیف ہیں۔

عربی کی بعض خالص فنی کتابوں کو مولانا نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جس انداز سے انہوں نے یہ خدمت انجام دی ہے، اس میں کوئی ان کا ثانی یا حریف نہیں ہے، انہوں نے فلسفہ و منطق کی پیچیدہ عربی عبارتوں کو اردو میں اس خوبصورت اسلوب میں منتقل کیا ہے کہ وہ اردو ادب کا بہت بڑا حصہ قرار پائی گئی ہیں اور ان علوم کی ثقیل اور بھاری بھر کم اصطلاحوں کو اس نجی سے اردو زبان میں استعمال کیا ہے کہ ان کی ثقالت ادب کی دلکش عبارتوں کا روپ دھار گئی ہے۔ مثلاً ”سرگزشت غزالی“ کے نام سے غزالی کی ”المقذ من الصال“ کا اردو ترجمہ ”تہافت الفلاسفہ“ کا ترجمہ ”قدم یونانی فلسفہ“ کے نام سے ”مقاصد الفلاسفہ“ کا ترجمہ ”مسلمانوں کے عقائد و افکار“ کے نام سے، امام ابو الحسن اشعری کی ”مقالات الاسلامیین“ کی دو جلدیں کا ترجمہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اس مکتوب کا ترجمہ جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے موضوع پر فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اور جسے ”مکتوب مدنی“ کہا جاتا ہے،

— مرزا نیت نے زاویوں سے —

یہ سب ترجم مولانا کے علمی شاہکار اور موضوع پر ان کے بے پناہ عبور پر دلالت کنال ہیں، مکتوب مدنی کے سوا مولانا نے ان میں سے ہر کتاب پر طویل مقدمہ پر در قلم کیا ہے اور ہر کتاب کے مقدمے میں موضوع کتاب کی بھی وضاحت کی ہے، کتاب کے مندرجات کا پس منظر بھی بیان کیا ہے، بعض اصطلاحات کو بھی معنی کیا ہے، اس دور کے مسائل و حالات کی بھی توضیح کی ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب کیوں تصنیف کی نیز مصنف کے سوانح حیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خوش اسلوبی کے ساتھ ترجمے کے مراحل طے کرنا نہایت مشکل ہے اور اصل کتاب تصنیف کرنے سے یہ زیادہ وقت طلب کام ہے، مترجم کیلئے تین اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے:

اول! جس زبان میں کتاب لکھی گئی ہے، اس زبان سے وہ کامل آگاہی رکھتا ہو۔

ثانی! جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہے، اس پر اسے پورا عبور حاصل ہو۔

ثالث! کتاب جس موضوع پر مشتمل ہے، اس موضوع پر اس کی گرفت ہو۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ ان تینوں اوصاف سے متصف تھے، وہ دونوں زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے اور موضوع پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ان کے پاس الفاظ کا وسیع ذخیرہ موجود تھا اور ان کے استعمال پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی، ترجمے کے سلسلے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر مصنف اسے اردو زبان میں لکھتا تو کس انداز اور کس اسلوب میں لکھتا۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ عام معاملات میں نہایت زندہ دل اور بے حد فراخ حوصلہ تھے اور صلح کل طبیعت کے مالک! لیکن ممکرین حدیث اور مرزا نیتوں کے بارے میں ان کے احساسات بالکل دوسری قسم کے تھے علمی اور فکری اعتبار سے ان دونوں

گروہوں سے ایک لمح کے لئے بھی نہ وہ ہم آہنگ ہو سکتے تھے اور نہ ان سے کسی صورت میں مصالحت کے قائل تھے۔ ان کا نام سننے ہی ان کا لہجہ بدل جاتا تھا اور قلم کی رفتار میں تیزی آ جاتی تھی منکرین حدیث کے متعلق ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ان کی تحریرات کی روشنی میں کسی دوسرے موقعے پر کی جائے گی، یہاں ہم صرف مرزا نیت کے بارے میں اختصار کے ساتھ ان کا زاویہ فلک قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں..... لیکن اس سے پہلے چند الفاظ میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مرزا نیت کے موضوع پر اہل حدیث علمائے کرام نے کیا خدمات سرانجام دیں۔

مرزا صاحب پر کفر کا سب سے پہلا فتویٰ مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے تیار کیا تھا اور اسے اپنے استاد عالی مرتبت حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کی خدمت میں پیش کر کے اس پر ان کے دستخط کرائے تھے، مرزا صاحب اور ان کے ساتھی اس سے نہایت پریشان ہوئے تھے اس لئے مولانا بٹالویؒ نے ہندوستان کے دور دراز مقامات میں رہنے والے دوسو معروف و ممتاز علمائے عظام سے خود مل کر یا اپنے نمائندے بھیج کر اس فتوے پر ان کے تائیدی دستخط کرائے تھے اور اس پر انہوں نے اپنی مہریں ثبت فرمائی تھیں۔ مرزا صاحب اور ان کے ساتھی اس فتوائے تکفیر سے نہایت پریشان ہوئے تھے، چنانچہ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

”علمائے پنجاب اور ہندوستان کی طرف سے فتنہ تکفیر و تکذیب حد سے گزر گیا ہے اور نہ صرف علماء بلکہ فقراء اور سجادہ نشیں بھی اس عاجز کے کافراور کاذب ٹھہرانے میں مولویوں کی ہاں میں ہاں ملار ہے ہیں، ان لوگوں کے اغواء سے ہزاروں لوگ ایسے یاۓ جاتے ہیں کہ وہ ہمیں نصاریٰ اور ہندو سے بھی اکفر سمجھتے ہیں اگرچہ اس تکفیر کا بوجھ نذر حسین دہلوی کی گردن پر ہے مگر تا ہم دوسرے مولویوں کا یہ گناہ ہے کہ

انہوں نے اس نازک امر تکفیر میں اپنی عقل اور اپنی تفہیم سے کام نہیں لیا بلکہ نذر حسین کے دجالانہ فتوے کو دیکھ کر جو محمد حسین بٹالوی نے تیار کیا تھا، بغیر تحقیق کے ایمان لے

(انجام آنکھم از مرزا غلام احمد قادریانی صفحہ 45 مطبوعہ 1897ء) آئے۔

فتاوے تکفیر کے بارے میں مرزا صاحب کی یہ عبارت بالکل واضح ہے اور انہوں نے صاف لفظوں میں تحریر کیا ہے کہ ان کو کافر قرار دینے کا فتویٰ سب سے پہلے مولانا محمد حسین بٹالوی نے لکھا اور سب سے پہلے اس فتویٰ پر حضرت میاں سید نذر حسین نے دستخط کئے اور ان کے دستخط دیکھ کر پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علماء اور سجادہ نشینوں نے بلکہ بقول مرزا صاحب نکے وہ علماء و سجادہ نشین "اس فتوے کو دیکھ کر" اس پر "ایمان لے آئے ہیں"۔

اس فتوے کے سلسلے میں دوسری جگہ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی محمد حسین نے یہ فتویٰ لکھا اور میاں نذر حسین دہلوی سے کہا کہ سب سے پہلے اس پر مہر لگادے اور میرے کفر کی بابت فتویٰ دے دے اور تمام مسلمانوں میں کافر ہونا شائع کر دے۔ سو اس فتوے اور میاں صاحب نذر کی مہر سے پارہ برس پہلے یہ کتاب (براہین احمدیہ) تمام پنجاب اور ہندوستان میں شائع ہو چکی تھی اور مولوی محمد حسین جو پارہ برس بعد اول المکفرین بنے، بانی تکفیر کے وہی تھے اور اس آگ کو اپنی شہرت کی وجہ سے تمام ملک میں سلگانے والے میاں نذر حسین دہلوی تھے۔"

(تحفہ گلزاریہ از مرزا قادریان۔ صفحہ 121 مطبوعہ قادریان 1914ء)

مرزا صاحب کے ان الفاظ نے بات بالکل صاف کر دی ہے کہ ان کی "تکفیر کے بانی" مولانا محمد حسین تھے اور حضرت میاں صاحب "اس تکفیر کی" آگ کو اپنی شہرت کی وجہ سے تمام ملک میں سلگانے والے" تھے۔ یعنی حضرت میاں صاحب

پورے ہندوستان کے علماء زعماء میں اپنا ایک علمی مقام اور شہرت رکھتے تھے، اس کی وجہ سے تمام ملک میں یہ فتویٰ پھیلا اور لوگوں نے مرزا صاحب کو اس فتوے کی بناء پر کافر قرار دیا۔

مرزا صاحب کے زمانے میں لدھیانہ وغیرہ کے بہت سے علمائے احناف موجود تھے لیکن انہوں نے اپنی "کفار کے بانی" اور "اول المکفرین" مولانا محمد حسین بیالوی اور حضرت میاں نذیر حسین دہلویؒ ہی کو کہا ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مساجد سے وہابیوں کو نکالنے (اخراج الوبایین عن المساجد) کا فتویٰ لدھیانہ کے علمائے کرام نے جاری فرمایا تھا۔ اس دور میں جب کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت وہابیوں کو با غی قرار دے کر وسیع پیانے پر انہیں گرفتار کر رہی تھی، ان پر بغاوت کے مقدمے قائم کر کے انہیں سخت سے سخت سزا میں دے رہی تھی اور ان کی جائیدادیں ضبط کر کے انہیں کا لے پانی بھیج رہی تھی، ان پر مسجدوں سے نکال دینے کے فتوے لگانا انتہائی معنی خیز بات تھی اس "معنی خیزی" کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ انشاء اللہ کسی اور مقام پر اس کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

علماء لدھیانہ کے دستخط

کفار مرزا کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ مولانا بیالویؒ کے تیار کردہ فتوے پر ہی حضرت میاں صاحبؒ کے علاوہ دستخط کرنے والوں میں علمائے لدھیانہ بھی شامل ہیں اور ان کے دستخط اس طرح ہیں:

مشاقِ احمد، نورِ محمد، عبدالقادر، قربان علی لکھنؤی، محمد حسن رئیس و گروہ اہل حدیث لدھیانہ، نور الدین خاں (ملاحظہ ہو مرزا غلام احمد قادریانی اور اس کے پیروکار دائرہ

اسلام سے خارج ہیں۔“

(مرتبہ مولانا محمد حسین بٹالوی شائع کردہ دارالدعاۃ السلفیہ، لاہور صفحہ 100)۔
اسی فتوے پر مولانا بٹالوی نے علمائے دیوبند اور سہاران پور کے دستخط کرائے،
ان کے اہم نئے گرامی ان کی تحریر فرمودہ عبارت کے نیچے اس طرح درج ہیں! حررہ
خلیل احمد مدرس دوم مدرسہ عربی دیوبند، کتبہ عزیز الرحمن دیوبندی، العبد محمود دیوبندی
معرفت مولوی محمد حسن صاحب، العبد رشید احمد گنگوہی، حررہ عبد الرحمن عفی عنہ، العبد محمود
حسن عفی عنہ، حررہ محمد حسن عفی عنہ، احقر بشیر احمد، حررہ محمد جان علی عفی عنہ،

(حوالہ مذکور صفحہ 153)

یہ مولانا بٹالوی کی بہت بڑی خدمت ہے کہ انہوں نے فتوائے تکفیر تیار کیا اور پھر
متعدد ہندوستان کے مختلف بلا و قصبات کے علمائے کرام کے اس پر دستخط کرائے۔
رحمہم اللہ تعالیٰ

فتاوائے تکفیر کے علاوہ مولانا بٹالوی نے براہ راست مرزا صاحب سے مباحثہ بھی
کیا، اسے مباہلے کی دعوت بھی دی اور اس کی تحریروں کا جواب بھی تحریری صورت میں
diya۔ بلاشبہ اس دور کے برصغیر کی جماعت علماء میں مولانا بٹالوی پہلے عالم تھے جنہوں
نے مرزا قادریانی کے مقابلے میں محاذ کھولا اور ہر محاذ میں اسے شکست دی۔

مرزا صاحب کی تکفیر کے متعلق مولانا محمد حسین بٹالوی کے فتوے کے بعد، مختصر
الفاظ میں ہم حضرت مولانا شناع اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ، کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا امرتسری نے اس عہد میں جس انداز سے مرزاںیت کا مقابلہ کیا اس کی
مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ تحریری، تقریری اور مناظر انہ رنگ میں ہر محاذ پر انہوں نے
مرزاںیوں کو لالکارا۔ مرزا علام احمد سے لے کر نیچے درجے کے مرزاںی مبلغوں تک

انہوں نے نہایت جرأت سے نکل دی۔ کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ جب ان کے گور و گھنٹاں (غلام احمد) سے پنجہ آزمائی کر چکے ہیں، تو ان چھوٹے درجے کے مبلغوں کو منہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ دینی اہمیت کو پیش نگاہ رکھا اور بڑے چھوٹے ہر مرزا تی کا ہر موقع پر تعاقب کیا۔

وہ پہلے عالمِ دین ہیں، جنہوں نے برسِ عام مرزا بیویوں سے مناظرے کی طرح ڈالی۔ 1902ء میں مرزا صاحب نے ”اعجازِ احمدی“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں مولانا شاء اللہ امر تسریؒ کو چیلنج دیا کہ وہ قادیان آئیں اور میرے الہامات کو غلط ثابت کریں۔ ہر الہام کے بدلے انہیں سورپے انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ تمام الہامات غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے کے انعام کے مستحق ہوں گے۔

مرزا صاحب کے چیلنج کے جواب میں 11 جنوری 1903ء کو مولانا قادیان پہنچے اور مرزا صاحب کو مقابلے میں آنے کی دعوت دی لیکن وہ مقابلے میں نہیں آئے اور محمد احسن امر وہوی کے ہاتھ رقعہ لکھ کر بھجوایا کہ وہ قسم کھا کر اللہ سے عہد کر چکے ہیں کہ وہ کسی سے مناظرہ نہیں کریں گے۔

یہ رقعہ پڑھ کر مولاناؒ نے قادیان میں تقریر کی اور مرزا صاحب کو ان کے گھر میں بار بار سامنے آنے کی دعوت دی لیکن وہ نہیں آئے۔

اعجازِ احمدی 1902ء کے آخر میں چھپی تھی، اس کتاب میں مرزا صاحب نے مولانا امر تسریؒ کی فضیلت علمی کا بھی اعتذار فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ شاء اللہ کو مسلمانوں میں قبولیت کا مقام حاصل ہے۔

مرزا صاحب کا مولانا شاء اللہ امر تسریؒ نے اس پاردی اور تسلسل کے ساتھ چھپا

کیا کہ وہ شدید گھبراہٹ میں بنتا ہو گیا اور پکارا تھا کہ جھوٹا سچ کی زندگی میں مر جائے۔ 15 اپریل 1907ء کو اس نے ”مولوی شاء اللہ صاحب“ کے ساتھ آخري فیصلہ“ کے عنوان سے اشتہار شائع کیا اور اس سے تقریباً گیارہ میئنے بعد وہ 24 مئی 1908 کو احمد بلڈنگ لاهور میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کے مکان پر ہیضے کی بیماری سے مر گیا۔ یہ اس کی واحد دعاء یا بدعا تھی جو قبول ہوئی۔ حضرت مولانا شاء اللہ صاحب نے اس سے چالیس برس بعد 15 مارچ 1948ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

بیہاں یہ بھی سنتے جائیے کہ مرزა صاحب کے دعویٰ نبوت کرنے سے پہلے ان کے عقائد و افکار سے مطلع ہو کر مولوی عبدالحق غزنوی سے ان کا مقابلہ ہوا تھا، جس کا نتیجہ مرزა صاحب کے خلاف نکلا۔

ان چند نہایت مختصر گذار شات کے بعد اس کتاب کی طرف آئیے جو ”مرزا نیت نے زاویوں سے“ کے نام سے ہمارے زیر مطالعہ ہے، یہ کتاب مولانا محمد حنف ندوی کے بعض مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے ہفت روزہ الاعتصام میں اس کے ابتدائی دور 1950ء اور اس کے گرد و پیش میں تحریر فرمائے تھے، مولانا نے نہایت علمی انداز میں مرزانیت کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔ اس کتاب میں جہاں اور بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں ایک انتہائی اہم بات یہ معرض بیان میں لائی گئی ہے کہ پاکستان میں مرزانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ خود مرزانیوں کو حکومت سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ انہیں اقلیت کا درجہ دیا جائے۔ اس سے قبل مرزانیوں کو کافر تو سب مسلمانوں نے قرار دیا تھا لیکن انہیں حکومت سے اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کسی نے نہیں کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی جماعتوں میں سب سے پہلے یہ آواز مولانا محمد حنف ندوی نے بلند کی اور ”الاعتصام“ میں اس موضوع پر مدلل مضامین

— مرازائیت نے زاویوں سے

پر قلم فرمائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح مرا صاحب کے لئے سب سے پہلے تکفیر کا فتویٰ اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالویٰ نے تیار کیا تھا، اسی طرح امیر مرازائیہ کو پاکستان میں اقلیت قرار دینے کی آواز سب سے پہلے مولانا محمد حنف ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بلند کی جو کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

مولانا نے ہفت روزہ ”الاعتصام“ میں جس زمانے میں مرازائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک کی تھی، اس زمانے میں چوبہری ظفر اللہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے منصب پر فائز تھے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ مرازائی تھے مولانا مرازائیوں کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

”چوبہری ظفر اللہ کے موجودہ اثر و رسوخ سے الگ ہو کر انہیں سوچنا چاہئے کہ ان کا حقیقی فائدہ کس بات میں مضمر ہے؟ کیوں کہ جلد یا بدیر چوبہری ظفر اللہ کا یہ اثر بہرآئینہ ان سے چھننے والا ہے، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بڑی سے بڑی ملازمتیں بھی کسی گروہ کے لئے کوئی تحفظ نہیں ہوتیں۔ حقیقی تحفظ یہ ہے کہ پاکستان کے دستور میں ان کے لئے مخصوص اقلیت کی حیثیت سے جگہ ہو۔“

اس سے آگے مولانا فرماتے ہیں:

”هم اس کے لئے تیار ہیں کہ انہیں ایک اقلیت بھیں اور ان سے اسی طرح کا برتابہ کریں، جس طرح کا اقلیت سے کرنا چاہئے۔ لیکن ہم اس پر آمادہ نہیں ہیں کہ انہیں اسلام کے نام پر ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔“

”آئندہ دستور میں مرازائیوں کی جگہ“ کے عنوان سے مولانا نے زیر نظر کتاب میں مرازائیوں کے عقائد و تصورات کا ذکر نہایت خوبصورت الفاظ میں کیا ہے، ان کے عقائد و تصورات کی روشنی میں مولانا رقم فرماتے ہیں:

”ہماری رائے میں خود قادر یا نہیں کو اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی ایک شاخ ہیں۔ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ رشتے داری کو منوع گردانستہ ہیں، ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور ان کے جنائزوں میں شریک نہیں ہوتے، لہذا خود ان کیلئے یہی مناسب ہے کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے پاکستان میں رہیں..... اقلیت کی یہ رعایت بھی ان کے لئے بس ایک ناگزیر رعایت ہے، جو حالات کی مجبوریوں سے دی گئی ہے ورنہ خالص اسلامی طرز عمل تو وہی ہے، جو حضرت ابو بکرؓ نے مرتدین کے مقابلے میں اختیار کیا۔“

1952ء کے آخر میں مرتضیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک پاکستان میں چلی تھی، جس میں ملک کی تمام مذہبی جماعتوں نے حصہ لیا تھا اور اس کے نتیجے میں حکومت پاکستان نے بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا، گرفتار شدگان میں علمائے کرام بھی بہت بڑی تعداد میں تھے۔ لیکن اہل حدیث ملک سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام اور عوام کی تعداد سب سے زیاد تھی۔ بعض مقامات کے تمام اہل حدیث باشندوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا، ملک کے متعدد دیہات میں صرف اہل حدیث ملک کے حاملین آباؤ ہیں، ان سب کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ مثلاً ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کے چک نمبر 23 گ ب کے تمام اہل حدیث حضرات کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور میں فیصل آباد جیل میں ان سے ملاقات کے لئے گیا، تو اس دور کے سپرینڈنٹ جیل کی ہدایت پر جیل کا ایک افران لوگوں سے ملاقات کے لئے مجھے جیل کے اندر لے گیا تھا اور میں انہیں دیکھ کر نہایت متحیر ہوا کہ گاؤں کے تمام اہل حدیث جیل میں بند ہیں۔ یہ سب لوگ میرے رشتے دار تھے، اسی طرح خود میرے گاؤں چک نمبر 53 گ ب منصور پور (تحقیل جڑانوالہ) کے بہت سے لوگوں کو پکڑ

لیا گیا تھا، اس دور کے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کی جامع مسجد میں وہ لوگ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تھے، جو اس تحریک میں اپنے آپ کو گرفتار کرانے کے خواہاں تھے، ان کا انتظام اہل حدیث عالم مولانا علی محمد صوصاصم اور مجلس احرار کے رہنمای قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے سپرد تھا۔ اسی طرح 1974ء میں مرزا نیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک جاری ہوئی، تو اس میں بھی بے شمار اہل حدیث حضرات نے حصہ لیا اور اس تحریک کو کامیاب کرنے کیلئے میدانِ عمل میں نکلے اور یہ تحریک کامیاب ہوئی، اس وقت پاکستان کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے، انہوں نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کیا اور مرزا نیوں کو کافر قرار دے کر اقلیتوں کی فہرست میں شامل کیا۔

یہ ایک نہایت تاریخی مسئلہ ہے، جسے قلم و قرطاس سے تعلق رکھنے والے اہل حدیث حضرات کو مرکز موضع بنانا چاہئے اور اس باب میں اپنی اور اپنے بزرگوں کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کرنا چاہئے۔ یاد رہے کوئی دوسرے اکسی کے کارناموں کو بے شک وہ کتنی بڑی اہمیت کے حامل ہوں، بیان نہیں کرتا اپنی بات خود بیان کرنا چاہئے اور اپنے کارناموں سے جو خالص دینی یا سیاسی نوعیت کے ہیں، موجودہ اور آنے والی نسلوں کو مطلع کرنا چاہئے۔ جو لوگ انکسار سے کام لیتے ہیں اور بات ظاہر کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں، وہ تاریخ کو چھپاتے ہیں اور صحیح واقعات پر پردہ ڈالنے کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اب مرزا نیوں کے سلسلے میں اہل حدیث کی اولیات ملاحظہ فرمائیے:

☆ مرزا غلام احمد پر تکفیر کا فتوی سب سے پہلے حضرت مولانا محمد حسین بیالوی نے تیار کیا اور اس پر اپنے استاذ عالی قدر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے دستخط کرائے اور پھر پنجاب و ہندوستان کے تقریباً دو سو ماہیر علماء کرام کی خدمت میں اس

فتے کا مضمون پیش کیا اور ان سے اس طرح اس کی تصویب و تصدیق کرائی کہ انہوں نے اس پر دستخط ثبت فرمائے یا اپنی مہریں لگائیں۔

☆ مرازاصاحب سے مقابلے کے لئے سب سے پہلے عالم جو قادیان گئے، وہ حضرت مولانا شناع اللہ امرتسریؒ تھے، یہ جنوری 1903ء کا واقعہ ہے، انہوں نے مرازاصاحب کے گھر جا کر انہیں لکارا، لیکن مرازاصاحب مقابلے کے لئے نہیں نکلے۔

☆ مرازائیوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ سب سے پہلے مولانا محمد حسین بٹالویؒ اور مولانا شناع اللہ امرتسریؒ نے شروع کیا۔

☆ جس تعداد میں مولانا شناع اللہ صاحبؒ نے مرازائیوں سے مناظرے کئے اس تعداد میں کسی نہیں کیے۔

☆ مسلمانان بر صغیر کی طرف سے ”فاتح قادریان“ کا لقب مولانا شناع اللہ ہی کو دیا گیا۔

☆ مرازاصاحب کو مبارہ کا چیلنج سب سے پہلے اہل حدیث علماء کرام نے دیا۔

☆ مرازائیت کے خلاف سب سے زیادہ کتابیں اہل حدیث مصنفوں نے لکھیں۔

☆ قیامِ پاکستان کے بعد ملک کے دستور میں مرازائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ تحریری صورت میں سب سے پہلے اہل حدیث عالم مولانا محمد حنیف ندویؒ نے کیا، بلکہ مرازائیوں کو توجہ دلاتی کہ وہ خود حکومت سے مطالبہ کریں کہ انہیں ملک کے دستور میں اقلیت کا مقام دیا جائے تاکہ ان کی مخالفت

— مرزا ایت نے زادیوں سے

میں روز بروز کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

☆ مرزا ایت کے خلاف حقیقیں چلیں، ان میں سب سے زیادہ اہل حدیث علماء اور عوام نے حصہ لیا اور اس کے نتیجے میں حکومت نے انہیں گرفتار کیا۔

آخر میں یہ عرض کر دیں کہ یہ کتاب جو مرزا ایت نے زادیوں سے، کے نام سے تقاریں کرام کے زیر مطالعہ ہے، پہلی دفعہ فروری 1953ء میں شائع ہوئی تھی اور چند روز میں ختم ہو گئی تھی، اب یہ نایاب تھی، اس کا نام بھی ادبیت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور اس کے مندرجات میں بھی علم و فکر اور ادب و انشاء کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مرزا ای علم کلام اور اس کے ذہنی و عملی نقطہ نظر کی پوری تصویر اس میں کھیچ دی گئی ہے۔

”طارق اکیڈمی“ مبارک باد کی مستحق ہے، جس نے اس نایاب علمی ذخیرے کو اڑتا لیں برس بعد شائقین کے علم و مطالعہ میں لانے کا عزم کیا۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مصنف کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، طارق اکیڈمی کے ارباب انتظام کو علم و ادب کی خدمت کے موقع فراہم فرمائے اور تقاریں محترم کو اس کتاب سے استفادہ کی توفیق سے نوازے۔

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی ساندہ لاہور

صفر 1421ھ 13 مئی 2000ء

اپنے افیکٹ

ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو مرزا نیت کو اس کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ وہ ایک فتنہ تھا، جواب ختم ہو چکا۔ کیونکہ ان حالات میں جبکہ پاکستان معرض وجود میں آیا ہے، اس کو بالکل نئے قسم کے مسائل کا سامنا ہے، ایسے مسائل جو پوری دنیا کو پریشان کئے ہوئے ہیں مرزا نیت کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کبھی کوئی جواب نہ تھا۔

یہ پہلے پہل مغض ایک غلط فہمی تھی۔ اس کے بعد اس نے مناظرانہ ادعاء کی شکل اختیار کر لی۔ اور پھر جب انگریز کی چشم دور رُس نے اس میں اپنے استعاری عزم کی محکمی واستواری کے امکانات دیکھ کر سر پرستی کی اور منصب و اعزاز کے متعدد روازوں کو اس پر کھول دیا تو باقاعدہ ایک جماعت اور گروہ کا روپ دھار لیا جس نے ازراہ اخلاق متحده ہندوستان اور اسلامی ممالک میں، تبلیغ کے رنگ میں برطانیہ کے سیاسی ارادوں کی تمجید کے سلسلہ میں وہ کام کر دکھایا، جو عیسائی مشنری ہزاروں صلاحیتوں کے باوجود نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی مسلمانوں کی اس عصبیت و جوش پر تیر چلانے کی کوشش کی جوان کو جہاد پر اکس سکتا تھا۔ اور انگریز کے خلاف آمادہ پیکار رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں اس شرارت کا ایک فائدہ انگریز کو یہ پہنچا کہ مسلمان وقت کی صحت مندرجہ یکوں کا

ساتھ دینے اور ان دینی و شفاقتی مضرتوں پر غور کرنے کے بجائے جو انگریز کی آمد آمد سے ان کو پہنچی تھیں لا طائل مناظرات و مجادلات میں الجھ گئے۔

بحمد اللہ انگریز کا یہ منحوس سایہ مرزاںیت کی تائید و حمایت کے علی الرغم اب سروں سے اٹھ چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فتنے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں جاری ہے۔ جو صرف اس کی نگرانی و حوصلہ افزائی کی وجہ سے زندہ تھے۔ لہذا اس امر کا اب کوئی حقیقی امکان نہیں رہا کہ مرزاںیت آئندہ پروان چڑھے گی۔ نوجوانوں میں پھیلے گی اور اپنی دعوت کے دائروں کو وسیع کر پائے گی۔ کیونکہ اس نوع کا خطرہ کسی تحریک سے اس وقت ہوتا ہے جب اس میں علمی گہرائیاں ہوں، ایجادی پیغام ہوں۔ اور ایسے تصورات ہوں، جن کا زندگی سے گہرالگاؤ ہو یا پھر بدرجہ اقل تحریک کے حاملین میں اچھے نمونے پائے جائیں۔ مگر یہاں تو یہ عالم ہے کہ یہ تینوں چیزیں مفقود ہیں، وہ نہ تو اپنی تہوں میں کوئی اونچا نصب العین ہی رکھتی ہے، نہ اس کی تعلیمات میں زندگی کی موجودہ اقدار سے بحث کی گئی ہے، اور نہ اس کے ماننے والوں میں کوئی مابدال امتیاز ایسا ہے، جو سیرت و کردار کے لحاظ سے کشش اور جذب سے بہرمند ہو۔

سوال یہ ہے کہ اگر مرزاںیت ایسا ہی حقیر فتنہ ہے اور اس کا دورنگی الواقعہ گزر چکا ہے تو ہم نے ”الاعتصام“ میں اس کے بارہ میں خواہ مخواہ کیوں مضامین لکھے، اور کیوں بغیر کسی غرض و مقصد کے اب ان کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے، اس اعتراض کے ہمارے پاس دو جواب ہیں۔

(۱)۔ اس لئے کہ دینی و علمی اعتبار سے اگرچہ مرزاںیت کے لئے مستقبل میں کوئی چمٹ نہیں اور یہ مذہب اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکا ہے تاہم سیاست کی نئی کروڑوں نے ایک پیچیدگی ضرور پیدا کر دی ہے اور وہ یہ کہ اس مسلک کو ماننے والے ایک معقول تعداد

میں پاکستان میں موجود ہیں۔ اور بظاہر پاکستان کے شہری بھی ہیں لیکن ان کی سابقہ روایات، ان کا بے لوث عقیدہ اور قادیانی کا بھارت میں رہ جانا ایسے امور ہیں کہ ان کے پیش نظر اگر ان کی حیثیت و موقف سے متعلق ٹھیک ٹھیک فیصلہ نہ کیا گیا تو یہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کی صورت میں خداخواستہ سخت مضر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جنگ نہیں چاہتے اور بھارت کی اکثریت بھی اس کی خواہاں نہیں لیکن کوئی ملک بھی آج جنگ کو بالکل نظر انداز کرے آئین کے بولموں تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا

”الاعتصام“ کے شائع شدہ مضامین میں ہم نے ان کے اس موقف کی تشریح کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ آئندہ آئین میں اگر انہیں اقلیت قرار دیا جائے تو اس پیچیدگی کا

لہ اس عظیم مفکر کا یہ خدشہ بالا خود رست ثابت ہوا، 1965 کی جنگ کے احوال و کوائف سے دستاویزی ثبوت مل گئے۔ چونڈہ یکٹر بالخصوص پاک بھارت جنگ آغاز سے لے کر مشتملہ معاهدہ تک کی پوری تاریخ دیکھ جائیے۔ اس دور کے روزنامہ افضل و دیگر قادیانی جرائد کی فائلیں ان تمام شواہد کی گواہ ہیں۔

65ء کی جنگ میں قادیانیوں نے کیا کیا سازشیں کیں پنجاب و کشمیر پر مشتمل قادیانی ریاست کی تشكیل اور اس کے لئے اس جنگ میں قادیانی فوجی افسروں کی ”قربانیوں“ نے باہم ثبوت مہیا کئے۔

اور اس کے بعد 71ء کی جنگ مشرقی پاکستان میں قادیانیوں کی سازشوں کا پورا جال، جس کے نتیجہ میں سقوط مشرقی پاکستان اور کم و بیش ایک لاکھ فوجی و سول نفری کا ”جنگی قیدی“، ہاتا ب محض الزام نہیں ناقابل تردید ہائق ہیں اور یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ان دونوں مواقع پر ظاہری طور پر اور پوشیدہ۔ ہیرو بھنو تھا۔ اور اس کے مشیرہ ”مہربان“ قادیانی تھے۔

مولانا تاریخۃ اللہ علیہ نے انہی مضرات کی طرف اشارہ کیا تھا جو ان کی خداداد بصیرت کا مظہر تھا۔ رحمہ اللہ رحمۃ والیہ و نورا اللہ ضریحہ ولی برکات اللہ علیہ، (اس کی تفصیلات ہماری زیر طبع کتاب ”قادیانیوں کے سیاسی عزائم“ میں ملاحظہ فرمائیں۔ خالد اشرف

حل نکل آتا ہے یہ مجموعہ انہیں مضامین پر مشتمل ہے۔

(۲) اس سبب سے بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب تک جو بحثیں اس پر ہو رہی تھیں ان کا انداز بالکل مناظرانہ اور سطحی قسم کا تھا جو با وجود تردید کے وہی ذہن پیدا کرتا تھا جو مرزائیت کا ہے ہم نے اس صورت حال کا جائزہ لیا اور کچھ نئے زاویوں سے اس مسئلہ پر نظر ڈالی اور بحث و فکر کی جدید روشن نکالی جس سے قارئین کرام تمام مفسدوں سے فجح کر سمجھ نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ جو اتحاد مناظرانہ انداز بحث سے ابھرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مرزائیت ایک خاص طرز استدلال کا نام ہے مخصوص عقیدوں کا نہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ دیکھنے میں ایک شخص ان کی تردید میں دلائل کا انبار لگا رہا ہو۔ لیکن فی الحقیقت اس کے باوجود ذہن کی "کیفیتوں" کے اعتبار سے اس میں اور مرزائیت میں کوئی فرق نہ ہو۔ ان مضامین کا مقصد اس مرزائیت سے اس کے حامیوں اور مخالفوں کو نکالنا ہے اور دونوں کو یہ بتانا ہے کہ نبوت والہام کے قاضی تائید و تردید کے فرسودہ اسالیب سے قطعی مختلف اور غیرمفید ہیں۔

ہمارے نزدیک اول تو اسلام ہماری تمام ضروریات کا کفیل ہے، اور اس کے مضمرات میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی عصر حاضر کو ضرورت ہے اور تعلیم و ارشاد کے داعیات نے اگر کسی وقت جبریل کو پکار رہی لیا تو اس وقت ظل و بروز سے کام نہیں چلے گا بلکہ ایک ایسی شریعت کے دروازے کھلیں گے جو ہر اعتبار سے نئی ہوگی۔ جن لوگوں کو دورِ حاضر کی دینی نفیات کو مٹو لئے کام موقع ملا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس وقت کا انسان مذہب کے معاملہ میں کس اضطراب میں بیٹلا ہے وہ یا تو اسلام کی ایسی بچی تلیٰ تعبیر کا طالب ہے، جو حد درجہ مختصر ہو، معقول ہو، اور موجودہ عصر کے تمام تقاضوں کا باحسن وجہ ساتھ دے سکے اور یا پھر وہ ایسے مذہب کو مانے گا جو بنیادی و اساسی

— مرزا نیت نے زادیوں سے

اقدار کے لحاظ سے تو ماضی سے ایک رشتہ و نسبت رکھتا ہو، مگر اپنے اسلوب، تینق، اور اخلاق کے اعتبار سے بالکل ہی نئی شے ہو۔

آپ ہی بتایے۔ جب ذہنوں کی یہ کیفیت ہو اور تنقی و طلب کا یہ عالم ہو تو شراب سے پیاس بجھ سکے گی؟ نبوت کے ظلی و بروزی تصور سے پیش آیندہ مسائل کا حل ڈھونڈا جا سکے گا؟

”مرزا نیت نے زادیوں سے“ ایسے ہی شریدی مضمایں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ یہ تصور جس کو مرزا صاحب نے پیش کیا ہے، نہایت ہی گھٹیا، غیر حکیمانہ اور بیکار ہے۔ اس سے مذهب و دین کا کوئی تقاضا پورا نہیں ہو پاتا۔ اور اس سے سو اقلیں و قال اور چند حوالوں اور مناظرانہ ہتھکنڈوں کے اور کچھ حاصل نہیں۔ اس سے نہ ہن کو فلسفہ کی بلندیاں میسر آتی ہیں، نہ ذوق میں ادب و لسان کی چاشنی کا اضافہ ہوتا ہے، اور نہ عمل ہی کوئی سمیتیں ملتی ہیں۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ اس سے ان لوگوں کو بہت فائدہ پہنچے گا جو غلط فہمی سے مرزا نیت کا شکار ہو گئے ہیں۔

محمد حنیف ندوی

(رحمۃ اللہ علیہ)



پیش لفظ

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مرزا غلام احمد صاحب اپنے ایک رسالے میں موئے حروف میں لکھتے ہیں کہ ”گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت عین عبادت ہے“ غالباً اسی وجہ سے ان کو بعض حضرات نے ”سرکاری نبی“ کا خطاب دیا ہے۔ پنجاب سائکل مارٹ لکھنؤ کے ایک کرم فرمانے دوران گفتگو میں فرمایا کہ آیت اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم میں منکم کے معنی علیکم ہے۔ یعنی تمہارا جو حاکم وقت ہو، اس کی اطاعت کرو۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے، جب تحریک ترک موالات اپنی شباب پر تھی۔ یہ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے، جب میں ندوۃ العلماء میں طالب علم تھا اس کے بعد ۳۵۔ ۳۶ء کا ذکر ہے، کہ ایک مبلغ میرے پاس تبلیغِ غلام احمدیت کے لئے آیا اسے یہ خیال تھا کہ اگر کپور تھلے کی شاہی مسجد کا خطیب غلام احمدیت کو قبول کر لے تو نصف آبادی کپور تھلے تو ضرور ہی حلقة دام میں آ جائے گی۔ اثنائے گفتگو میں میں نے مرزا صاحب کی اس مندرج بالاعمارت کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا کہ ”کیا ہر حکومت وقت کی اطاعت عین عبادت ہے؟ جواب ملا“ بے شک ”میں نے پھر دریافت کیا“ اگر اس وقت برطانیہ کی بجائے فرعون، نمرود، ہامان، شداد وغیرہ کی حکومت ہو، تو آپ اس حکومت کی اطاعت کو بھی اپنی عین عبادت تصور فرمائیں گے؟ جواب ملایقینا۔ مجھے

اس یقیناً پر کوئی خاص تھجت نہ ہوا۔ کیونکہ وہ رسالہ جس میں مرزا صاحب کی مندرجہ بالا عبارت تھی، انہی مبلغ صاحب نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ اس رسالے کا نام ”القول الصحیح فی نزول المسیح“ یا اسی عقیم کا کچھ نام تھا کچھ دنوں بعد میرزا بشیر الدین محمود صاحب کی ”تفہیم کبیر“ دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس میں سورہ یوسف کی تفسیر میں آپ نے استدلال فرمایا ہے کہ ”مسلمان کے لئے حکومت کافرہ کی ملازمت، وفاداری اور اطاعت جائز ہی نہیں بلکہ سنت انبیاء ہے، جیسا کہ سیدنا یوسف کے طرز عمل سے واضح ہوتا ہے۔“ (یہ الفاظ میرے اور مضمون صاحب تفسیر کبیر کا ہے) ”یہ سرکاری امام رازی“ صاحب تفسیر کبیر وہی بزرگ ہیں جو اپنے ایک کتابچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”میں نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر دو فرشتوں سے پڑھی ہے۔“ یہ سرکاری فرشتے ”اگر پیچی پیچی نہیں تو مجھے اس کا علم نہیں۔“

باتیں تو اور بھی بے شمار ہیں۔ میں نے چند حوالوں پر صرف اس لئے اکتفا کیا ہے کہ آپ کو بیک نظر معلوم ہو جائے کہ ”غلام احمدی مذہب“ کی اصل بنیاد کیا ہے؟ آپ پر یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اس کا لب لباب ہے ”ہر حکومت وقت کی اطاعت کو عین عبادت جانا“۔ یعنی اگر ابراہیم کی نکر ہو تو نمرود کی اطاعت کو ایمان سمجھو اور ابراہیم کو شہر بدر کر دو۔

اگر مویٰ و فرعون کا تصادم ہو تو فرعون کی وفاداری کو عبادت تصور کرو اور مویٰ سے مقابلہ کرو۔

اگر زکریاٰ و ہیرودیس کا مقابلہ ہو تو ہیرودیس کا ساتھ دو، اور زکریاٰ کا سر قلم کر

اگر آنحضرت ﷺ اور کفار قریش سے جنگ ہو تو کے کے رہنے والے غلام احمدی

وہی کریں جس کی میرزا صاحب نے تعلیم فرمائی ہے۔

اور اگر پاکستان و بھارت کی جنگ شروع ہو جائے تو بھارت کے غلام احمدی پورے خلوص و وفاداری کے ساتھ بھارتی فوج میں شامل ہو کر اپنے خلیفہ کے مقابلہ میں صفات آ را ہوں۔ اور خلیفہ صاحب پاکستان کی وفاداری میں اپنے مریدان باصفا کا صفائیا کریں۔ اور جسے فتح ہو وہ اسی طرح چراغاں کرے جس طرح عراق پر برطانوی قبضہ ہونے کے بعد قادیان میں چراغاں کیا گیا تھا۔

اور پھر میرزا صاحب کی روح پکارا ہے قتلہ ہما فی الجنة تم دونوں نے واقعی ہمارے مشن کی تکمیل کی اور اپنی حکومت وقت کی اطاعت و وفاداری کر کے میں عبادات کا ثبوت بھم پہنچا دیا۔ تم دونوں جن والنس نے مقصدِ تخلیق کو پورا کیا۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ایں کاراز تو آید و مردان چنیں کند، کتنا پائیزہ عشق ہے۔

فرمائیے! میں نے غلط کہا ہے کہ پاکستان بنتے ہی غلام احمدیت ختم ہو گئی۔ جو مشن اصولاً ختم ہو جائے اسے جماعت بھی ختم ہی سمجھتے۔ ایسی جماعتیں افاقت الموت کے کئی سنبھالے لینے کی مہلت بھی حاصل کر لیں تو وہ درحقیقت مردہ ہی ہوتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ ان کا اصول مردہ ہوتا ہے ورنہ محض زندگی تو چوپا یوں کو بھی حاصل ہے۔ غلام احمدی جماعت کی زندگی صرف برطانیہ کے بل بوتے پر قائم تھی۔ میرزا غلام احمد صاحب نے فرمایا تھا کہ ”برطانیہ ہماری تلوار ہے“ ظاہر ہے وہ تلوار ہے جس کے سہارے وہ قاتم تھے رخصت یا نقل ہو گئی تو غلام احمدیت کسی طرح زندہ رہ سکتی ہے؟

”وہ کون جو بگزی ہوئی تقدیر سنوارے“

ایسے پھیپھیے، بے ثبات، بے مغزا اور پادر ہوا اصول پر جس جماعت کی بنیاد ہو

اس کے افراد سے "ختم نبوت" اور دوسرے علمی مضمونوں پر مباحثہ کرنا میرے نزدیک تقضیع اوقات ہے۔ پہلے انہیں نفس "نبوت" سمجھائیے کہ نبوت کیا چیز ہے؟ کس لئے ہوتی ہے، اس کا کیا مشن ہوتا ہے؟ پھر ختم نبوت پر گفتگو کیجئے۔ اور دیگر مضاہیں کی طرف توجہ دلائیے۔ جس کے مغز میں نبوت کا مشن "برطانیہ (یا ہر حکومت وقت) کی اطاعت عین عبادت" ہو، اس سے پہلے نفس نبوت پر بات کرنی ہے تو اس پر کیجئے کہ تم اصولاً ختم ہو چکے ہو، یا اس پر گفتگو ہونا چاہئے، کہ خود احمدیت زندہ ہے یا نہیں؟

آپ پوچھیں گے کہ جب یہ فرقہ ایسا ہی ناقابلِ اعتناء ہے؟ اور یہ ختم ہی ہو رہا ہے تو مولا نا محمد حنفی ندوی نے یہ کتاب کیوں شائع کی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ غلام احمدیوں کو مقابل تعریض سمجھتے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بعض مسلمانوں کو ہوشیار کرنا ہے، غلام احمدی جماعت کا لشیق پر اور ان کے مبلغین بعض اوقات سادہ لوح مسلمانوں کو اس مسئلے پر گفتگو کرتے وقت چند مغالطوں میں ڈال دیا کرتے ہیں ان بنی مغالطوں سے ہوشیار کرنا کتاب کا اصل مقصد ہے۔

انشاء اللہ یہ کتاب غلام احمدی جماعت کے سمجھدار طبقے کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہے گی۔ اس کتاب میں مؤلف نے ان تمام مضاہیں کو جمع کر دیا ہے، جو وقتاً فو قتاً "الاعتصام" میں شائع ہوتے رہے اور مقبول ہوئے۔ مولانا نے اپنی تحریر میں عام مناظرانہ انداز سے احتراز کیا ہے اور جن جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اس کا انداز نرالہ اور اچھوتا ہے۔ استدلال پر زور، مزاج سنجیدہ، گرفت مضبوط اور حملہ زور دار ہے۔ نگارش کے متعلق میں خود کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔

الفضل ما شهدت به الاعداء کی مثل افضل نے پوری کردکھائی ہے۔ مدیر افضل جناب تنور صاحب افضل کا اعتراف فرمائچکے ہیں۔

ایک اور بات سن لیجئے۔ پاکستانی اور بھارتی غلام احمدیوں کی باہمی جنگ (بہ سلسلہ وفاداری حکومت وقت) کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کے متعلق ممکن ہے کوئی غلام احمدی آپ کو یہ کہہ کر مغالطے میں ڈالے کہ:

(۱) اگر افغانستان و پاکستان میں خداخواستہ جنگ ہو جاوے، تو دونوں طرف مسلمان ایک دوسرے کے خلاف لڑیں گے یا نہیں؟

(۲) عائشہ اور علیؑ کی فوجیں باہم برسر پیکار ہوئیں یا نہیں؟

(۳) اگر ہندوستان و پاکستان کی جنگ ہو تو دونوں طرف کے مسلمان فوجی ایک دوسرے پر گولی چلانیں گے یا نہیں؟

بس اسی طرح سمجھ لیجئے کہ دونوں کے غلام احمدی بھی باہم ایک دوسرے کا گلا کاٹیں گے۔

بطاہر یہ اعتراض بڑا اوزنی اور سادہ لوح مسلمانوں کو تذبذب میں ڈالنے والا نظر آئے گا۔ لیکن خوب سمجھ لیجئے، یہ ساری گفتگو ان کے دوسرے تمام مغالطوں کی طرح محض فریب ہو گا، اس لئے کہ:

اگر دو مسلمان گروہ یا حکومتیں باہم دست و گریبان ہوں تو گوایک ہی عند اللہ برسر حق اور دوسرا حق ہو گی لیکن دونوں اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر نبرد آزمائیں گی۔ کفر کی تائید کسی کے بھی پیش نظر نہ ہو گی۔ کفر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے جنگ کرنے والا صرف کافر ہے اور کچھ نہیں۔

اور اگر قوتِ کافرہ اور طاقتِ مسلمہ کی تکمیر میں دونوں مسلمان ہوں تو قوتِ کافرہ کی تائید اور تغلب علیِ اُملاءین کے لئے جنگ کرنے والے مسلمان نہیں کہے جاسکتے۔ اگر کوئی سیاسی مصلحت یا مجبوری ان کے پیش نظر ہو جب بھی وہ فتوائے فقیہ سے بچ نہیں

— مرزا نیت نے زاویوں سے

سکتے۔ برطانیہ کی تائید کے لئے مالک اسلامیہ پر حملہ کرنے والے فوجی مسلمان جس فتویٰ کے متعلق تھے، اسی فتویٰ کے متعلق وہ فوجی مسلمان ہوں گے، جو نہروں کی تائید میں پاکستان سے جنگ کریں۔

اور ان تمام باتوں کو جانے دیجئے۔ اسی قسم کے بھارتی فوجی مسلمانوں کے متعلق آپ اپنی بقا، مصلحت کوشی، تمدنے عہدہ و منصبِ فاسقانہ خود غرضی، کافرانہ تقیہ، قوم فروشی، خود فراموشی وغیرہ کے سارے الزام لگا لیجئے لیکن یہ کسی کے وہم و قیاس میں ہی نہیں آ سکتا کہ وہ نادان مسلمان پاکستانی مسلمانوں سے اس لئے جنگ کریں گے کہ ان کے پیغمبر ﷺ کا (نعوذ باللہ) یہ ارشاد ہے کہ نہر و گور نہست کی اطاعت عین عبادت ہے۔ ایک بدتر سے بدتر مسلمان بھی کسی ایسی "وہی" کا قائل نہیں جس کا معنی ہر حکومت وقت کی اطاعت کو عین عبادت سمجھنا ہو وہ حکومت کافر ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے الہامی فرما میں غلام احمدی بارگاہ ہی سے صادر ہو سکتے ہیں جن میں حکومت اسلامیہ کی ماتحتی و تائید میں جنگ کرنے والے اور حکومت کافر کی ماتحتی و تائید میں جان دینے والے یکساں عبادت کا درجہ رکھتے ہوں۔

آخر میں ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی اس کاوش فکری سے، غلام احمدیت کا پڑھا لکھا طبقہ متاثر ہو، اور اس پر یہ واضح ہو جائے، کہ نبوت کا مقام بہت اوپنچا ہے، اور مرزا غلام احمد صاحب اس کے مقابلہ میں کوئی درجہ نہیں رکھتے۔

محمد جعفر شاہ پھلواری

کیا یقین نبوت ہے؟

اس صدی میں جب ایک شخص ارعائے نبوت کے ساتھ ہمارے سامنے آئے گا اور قرآن کرے اس معیار کے بعد آئے گا تو لامحالہ ہم سب سے پہلے اسی پیمانے سے اسے جانچیں گے۔ ہماری کم سے کم توقعات اس سے جو ہوں گی وہ یہ ہوں گی کہ اس نے اگرچہ قوم کے سامنے کوئی لائھہ عمل نہیں رکھا، زمانے کے مسائل کو نہیں سمجھا، موجودہ تقاضوں پر نظر نہیں ڈالی، سیرت و عمل کے اعتبار سے کوئی بلند تر نمونہ نہیں چھوڑا، کم از کم اتنا تو کیا ہوتا کہ ابوالکلام کا ”الہلال“ اس کے جمالِ ادبی کے سامنے گھنا جاتا۔ حالی کا وہ مسدس جو نصف صدی سے گونج رہا ہے خاموش ہو جاتا اور حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کی شاعری اس کی چاکری کرتی، یہ کیا بد مذاقی ہے کہ ”براہین احمدیہ“ شبِ هجران سے بھی زیادہ طویل ہونے کے باوجود ایک پیرا اور جملہ اپنے اندر ایسا نہیں رکھتی کہ جس سے ذوق کی تسکین ہو سکے۔ کیا یہی نبوت ہے؟

ختم نبوت اور

اس
کے

حدود و اطلاق

- نئی بات کہنا مشکل ہے — ○
- معجم کے کچھ زینے — ○
- کہنے کا ذہنگ — ○
- ذہنگ سے کیا مقصود ہے — ○
- فکر و استدلال کے تین اصول — ○
- مناظر انہ ذہنیت — ○
- اس کا نتیجہ — ○
- اس کا اثر اعمال پر — ○
- مرزا آپ نے علم نظر کا صحیح تجربہ — ○
- حیات میچ — ○
- کیا مناظرہ جنگ ہے — ○
- مناظرہ اور دعوت — ○
- مناظرہ اور تبدیلہ خیال — ○
- ہرشے کے دو مزاج ہوتے ہیں — ○
- طبعات کی ایک مثال — ○
- مکانیکی ثبوت — ○
- حسن کی حقیقت — ○
- استدلال و استنباط کا معاملہ — ○
- ایک نکتہ — ○
- دوسری مقدمہ — ○
- تیسرا اصول — ○
- فکر و استدلال کی عام اغواش — ○
- ایک مثال — ○
- دوسری مثال — ○
- تبیر کی ضرورت — ○
- خلاصہ بحث — ○

ایک نیا جائزہ

”ختم نبوت اور اس کے حدود و اطلاق“

(ایک نیا جائزہ)

مرزا ایت سے متعلق مسائل پر اب جو قلم اٹھا ہے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ اس کے تمام متعلقات ایک نے زاویہ نظر سے ضبط تحریر میں آئی جائیں۔ پھر اللہ جانے اس کا موقع ملے یا نہ ملے، کیونکہ غور و فکر کے ہدف و معیار اس تیزی سے بدل رہے ہیں کہ بہت ممکن ہے۔ آئندہ مذہب پر اظہار خیال ہی دقیانویسیت سے تعبیر ہو۔ سب سے بڑا مسئلہ جو اس خصوصیں فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔ ”ختم نبوت“ ہے۔ اگر یہ حقیقت ثابتہ معرض بحث سے نکل کر پھر حقیقت کی حیثیت اختیار کر لے۔ اور اس کے تمام متعلقہ گوشے وضاحت سے سامنے آ جائیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مفید علمی کوشش ہو گی۔

نئی بات کہنا مشکل ہے

جہاں تک نفسِ دلائل کا تعلق ہے۔ باوصاف تحقیق اس باب میں کوئی نئی بات اور بالکل اچھوٹی بات ڈھونڈ لانا کہ لَمْ يَطْمِثُهُنَّ إِنْسَ قَبْلَهُمْ وَلَا جَاءُ (الرَّحْمَنُ، ۱۷) (نہیں ہاتھ لگایا کسی انسان نے پہلے اس سے اور نہ جنوں نے) مشکل ہے۔ کیونکہ جب سے جھوٹے مدعیان نبوت نے سرا اٹھایا ہے۔ علماء حق نے برابر ان کی تردید کیلئے ان مباحث کی چھان بین کی ہے۔ اور شاید ہی کوئی گوشہ ایسا چھوڑا ہو۔ جو آنے والوں کے لئے موضوع فکر ہو سکے۔ لیکن صرف دلائل ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ان کو

قرینے سے پیش کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ایک ہی حقیقت باوجود بار بار زیر نظر ہونے کے باساوقات ذہن سے اوچل رہتی ہے اور پھر سیاقے کے ایک ہی اشارہ سے ہو مدد ہوئی کا سارا ظسلم ٹوٹ جاتا ہے۔ قرآن حکیم کے دلائل پر کبھی لکھنے کا موقع ملا۔ تو اس کی اس خوبی پر کھل کر بحث کی جاسکے گی۔ کہ آیات و شواہد کے پیش کرنے میں یہ کن کن اداوں میں دوسروں سے ممتاز ہے۔ یہاں صرف اتنا یاد رکھئے کہ وہ کوئی انوکھی اور جدید بات لے کر نہیں آیا۔ نئے نئے دلائل کی اخلاقی و تکوین اس کا ہرگز منصب نہیں۔ وہ تو انہی حقیقوں کو جو ہمارے گرد و پیش پہیلی ہوتی ہیں۔ اور جن پر کبھی نگاہ اعتبار نہیں پڑتی اور اگر پڑتی ہے تو غور و فکر کیلئے نہیں رکتی۔ اس ڈھنگ سے پیش کرتا ہے کہ ذہن کی تمام صلاحیتیں خود بخود انہی حقیقوں پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کاران کے لئے نہیں رہتا۔ کہ یا تو ایک دم جھٹلائیں۔ اور یا پھر ان کی تصدیق کریں۔ یہ انداز اور یہ ڈھب حقیقی شے ہے۔

نتیج کے کچھ حصے

یوں سمجھئے کہ فکر سے پہلے اصابت فکر کا مرتبہ ہے۔ سوچنا اور بات ہے۔ اور صحیح سوچنا اور بات! ابساوقات ایک مسئلہ پر ہم گھنٹوں بحث کرتے ہیں۔ علم منطق کے تمام حریبے استعمال میں لاتے ہیں۔ اور پھر بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ لیکن جب ایک بارگی خود حقیقت ایک دوسرے انداز میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ تو ہمیں اپنی بیچارگی و جہل پر افسوس ہوتا ہے۔ کہ یہی بات تو ہزار دفعہ دوران بحث مناظرہ میں دلائل و اعتراضات کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔ لیکن دل میں نہ اتر سکی۔ اب یہ کیا معاملہ ہے کہ یہی چھوٹی سی اور نہایت پیش پا افتادہ حقیقت ہماری آنکھیں کھول دینے کیلئے دل کی طرف بے اختیار بڑھ رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ انسانی ذہن تک

اترنے کیلئے بچ کے کچھ زینے ہیں ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ذہن صاف ہے۔

دلائل میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ اور پیش کرنے کا ذہب منطقی طور پر استوار ہے۔ تو بات منوانے میں ایک منت کی تاخیر نہیں ہوگی۔ تاخیر والتواء یا ذہنیل کے تین ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو جو بات آپ کہتے ہیں وہ مبنی برحقیقت نہیں۔ یا پھر سننے والے کا ذہن صاف اور خاذ نہیں۔ یا پھر مسئلہ کو پیش کرنے کا ذہنگ صحیح نہیں۔

کہنے کا ذہنگ

اس تیسری بات کو میں زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ میرے نزد یہ کہنے کا اسلوب زیادہ درخور اعتنا ہونا چاہئے۔ بارہا ایسا ہوا ہے۔ کہ ذہن کی کجھی اور غیر استواری کے باوجود جب کوئی بات ذہب کی کی گئی۔ تو اس نے دل میں کہیں نہ کہیں جگہ پیدا کر ہی لی۔

ڈھنگ سے کیا مقصود ہے

ڈھنگ سے کہنے سے مقصود صرف افاظی نہیں۔ یا فصاحت و بلا غت نہیں کہ اس کا مرتبہ بعد کا ہے۔ اصل شے یہ ہے۔ کہ جس مسئلہ کو آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے آپ یہ دیکھ لیں۔ کہ خود اس کا مرتبہ کیا ہے۔ یعنی یہ محکمی واستواری کے کس درجہ میں ہے۔ اس کے بعد اس پر غور فرمائیے کہ اب تک جو اسے پیش کیا گیا ہے تو اس میں کن باریک علمی رعائتوں کو نظر انداز کر دینے سے اس کی مؤثریت میں فرق آیا ہے؟ وہ کیا نفیسیاتی یا منطقی نقاٹص ہیں۔ جن کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی رہی۔ اس کے بعد بھی اگر خصم نہیں مانتا۔ تو پھر آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ پھر آپ کے پاس یہ

معقول عذر ہے۔ کہ ممکن حد تک آپ کوشش فرمائے۔ مقدمہ کی خرابیاں آپ کے بس کاروگ نہیں۔ پانی میں سیدھی سے سیدھی شے بھی میرٹی نظر آئے گی فطرت کا بدلا ہمارے لئے دشوار ہے۔

انہی ھائقت کے پیش نظر آئے۔ ہم مسئلہ ختم نبوت اور اس کے حدود اخلاق پر غور کریں۔ اور دیکھیں۔ کہ سقم کہاں پیدا ہوا؟ کیا صرف وہ نفسیاتی ہے۔ یا استدلال و استنباط میں کہیں خامی ہے؟ سردست یا اگرچہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے۔ اور اپنے معنوں میں بالکل واضح۔ تاہم اسے معرض بحث میں لانے پر ہم مجبور ہیں۔ اس کا فیصلہ کہ حقیقت ثابتہ کیا ہے۔ اب دلائل پر موقوف ہے۔ اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونا بہرا مینہ بہت مشکل ہے کہ ایک حقیقت کو بحث کی سطح پر لا جائے۔ اور پھر اس حقیقت کی سطح تک پہنچایا جائے۔ مگر اس کا کیا سمجھئے۔ کہ ایسا ہونا ضروری ہے۔ کہ یہاں ذہنوں کی ساخت یک قلم مختلف ہے۔ سمجھنے کا انداز جدا جدائے۔ جو بات آپ کو اصول کی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ وہی دوسرے کے نزدیک مشکوک اور یکسر باطل۔

فلکرو استدلال کے تین اصول

ہم نے جہاں تک اس مسئلہ کی تفصیلات پر غور کیا ہے۔ یہاں پر تین مقدمات ایسے ہیں جن کی وضاحت ہو جانا چاہئے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ تین اصول ہیں جن کو بہرا مینہ ہر بحث میں مرعی رہنا چاہئے۔ ہم نے تمام اخلاقی مسائل پر غور کیا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں۔ کہ فلکرو استدلال میں جہاں کہیں فروگزاشت ہوتی ہے۔ وہ انہیں تین حقیقتوں کو نظر انداز کر دینے سے ہوتی ہے۔ یعنی ان تین مقدمات کا درجہ یہ ہے۔ کہ ان پر غور و فلکر کرنے سے ہر ہر مسئلہ میں آپ کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے اور اس کی مدد

سے آپ فوراً معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ استدلال کے اشہب تیز خرام نے کہا ٹھوکر کھائی ہے۔ ان میں ایک حقیقت نفیاتی مزاج کی ہے اور دوسرا دو مطلقی انداز کی۔

مناظر انہ ذہنیت

پہلے نفیاتی حقیقت کو لیجئے۔ کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ ذہن پر مناظر انہ کیفیتیں اثر انداز نہ ہوں۔ یعنی آپ بحث کے مودہ میں نہ ہوں۔ کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے۔ کہ نظر و فکر میں وہ کلیت و جامعیت پیدا ہو سکے۔ جو دن کے اسرار تک انسان کو پہنچاتی ہے۔ مناظر میں سب سے بڑا شخص جو پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ باوجود ذہانت اور جودت طبع کے کبھی اس لائق نہیں ہو پاتا۔ کہ دین کے مزاج کلی پر غور کر سکے۔ دین کے مصالح پر نظر ڈال سکے کہ اس کے اصول و بنیادی تقاضے کیا ہیں؟ اس کے الہیات، اخلاق، عبادات اور معاشرتی و اقتصادی نقشے انسان کو کس منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کے ماننے سے کس نوع کا طبقہ ظہور پذیر ہوتا ہے؟ کس طرح کے اخلاق سے انسان آ راستہ ہوتا ہے۔ اور عادات و عوائد میں کیا تغیر و نہما ہوتا ہے؟ وہ کیا سلحوں اور شاشنگی ہے جو اس کا مایہ افتخار و نازش ہے؟ یعنی مذہب کا وہ جمال اور حسن جو اس کی بنیاد اور اساس ہے۔ مناظر کی نظر سے او جھل رہتا ہے۔ اس کی نظر میں ایک طرح کی نیز ہ اور کبھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب سے جزئیات کی شوٹ اور جستجو میں لگا رہتا ہے۔ اور اصول اس کی نظر سے مخفی رہتے ہیں۔ اس کی ساری پر چول شاخوں اور پتیوں تک ہی رہتی ہے۔ اور اس تحقیق و تفحص کی مناظر انہ موشگانیوں میں اسے موقع ہی نہیں ملتا۔ کہ اس کے اس جمال سے لطف انداز ہو سکے۔ جس کا تعلق پورے

درخت کے پھیلاؤ سے ہے۔ گویا یہ پیڑ گنے کا قائل ہے۔ آم کھانا اس کے مقاصد میں داخل نہیں۔

اس کا نتیجہ

اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ نظر کی جزئیت کی وجہ سے اسلام پر جب غور کرے گا۔ تو جزئی حیثیت سے، اگر وہ معترض ہے۔ تو یہ دیکھے گا کہ کن کن آیات سے اعتزال کی تائید ہوتی ہے۔ ارجاء کا قائل ہے۔ تو سارا ذرائع اس پر لگائے گا کہ ارجاء کی آیات تلاش کی جائیں۔ اس طرح جبری یا قدری ہے تو اپنے ڈھب کی آیتیں دکھائے گا۔ اس کو اس سے کچھ مطلب نہیں ہو گا کہ اسلام بحیثیت مجموعی ہم سے کیا چاہتا ہے؟ جن لوگوں نے قرآن حکیم کی تقاضی کو دیکھا ہے۔ اور بالاستیعاب پڑھا ہے۔ انہوں نے دوران مطالعہ میں یہ کوفت محسوس کی ہو گی۔ کہ اس طرح کی بحثوں نے کیونکر قرآن کی حقیقی معنویت اور خوبیوں کو چھپا کھا ہے۔ بہت بڑا نقصان اسلام کو یہ پہنچا ہے کہ اس کے حکم و اسرار چند لا طائل بحثوں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اتنی جلیل القدر کتاب صرف مناظرانہ گتھیوں کو سمجھانے کیلئے نازل ہوئی ہے۔ انسانی زندگی کو سنوارنا اس کا مقصد نہیں۔

اس کا اثر اعمال پر کیا ہوتا ہے؟

عملی اعتبار سے اس کا اثر طبائع پر یہ ہوتا ہے۔ کہ مذہب کے تقاضے صرف اس قدر رہ جاتے ہیں کہ مخصوص مسائل پر آپ کے ذہن میں کتنا مادہ جمع ہے؟ اور کن کن دلائل سے آپ اپنے مسلک کو حق بجانب ٹھہرا سکتے ہیں؟ مذہب کی روح سے استفادہ پوری عملی زندگی میں اس سے رہنمائی کا ولولہ اور شوق یا اخلاق و عادات میں ایک

خاص طرح کا امتیاز قائم رکھنے کی تڑپ دائرہ عمل سے خارج قرار پاتی ہے۔ یعنی ایک مناظر اگر وہ مرزا تی ہے تو اس کی تمام ترمذ ہبی زندگی کامدار اس پر ہو گا۔ کہ وہ حیات صحیح کے مسئلہ پر بڑے سے بڑے عالم سے نکلا سکے۔ نظم نبوت کے مضبوط حصار کو توڑ سکے۔ مرزا صاحب کی کبھی نہ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو الیٰ ترازو پر تول سکے۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ یا تو تمام پہلے انبیاء علیہم السلام معاذ اللہ اسی طرح کی مہمل اور مقتضاد باتیں کرتے رہے ہیں اور یا پھر پیشین گوئی چیز ہی ایسی ہے کہ اس کے ٹھیک ٹھیک منشا تک رسائی ناممکن ہے۔ پھر اگر یہ منشا اس کے زعم کے مطابق پورا ہو جاتا ہے۔ تو اس کی نفیاتِ مذہبی کی تسلیم ہو جاتی ہے۔ وہ اب اس کا ہرگز مکلف نہیں ہے۔ کہ مذہب کے اصولی و اساسی تقاضوں پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ بات صرف مرزا تی مناظر ہی سے مخصوص نہیں۔ دینی تصور کا یہ بگاڑ ہر اس شخص میں پیدا ہو جاتا ہے جو اس ذہن کا حامل ہے۔ یعنی بحث و جدل کی اہمیت اس گروہ میں اس درجہ محسوس کی جاتی ہے کہ اسی کو حاصل دین سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نراعی مسائل پر ان کے انداز اور اسلوب پر نہیں سوچتے تو یہ بھی آپ کی اصابت رائے کے قائل نہیں ہو سکیں گے۔

مرزا تی نقطۂ نظر کا صحیح تجزیہ

یوں تو یہ ذہنیت بجائے خود اس لائق نہیں ہے۔ کہ کسی مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی توقع اس سے کی جاسکے۔ لیکن جو کبھی خصوصیت سے اس انداز فکر سے ذہن میں پیدا ہوتی ہے وہ تنگ نظری ہے۔ ایک مناظر کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت اس کی تمام متعلقہ تفصیلات پر سوچ چمار کی کبھی زحمت گوار نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا انداز یہ

ہوگا۔ کہ یہ ایک آیت یا ایک حدیث جس کو دیکھئے گا۔ کہ اس کے مقصد کو کسی حد تک پورا کر سکتی ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لے گا اور کوشش کرے گا۔ کہ یہیں کھونشا گاڑ کر بیٹھ جائے۔ اب نہ تو وہ خود یہاں سے بہلے گا اور نہ آپ کو بہنے دے گا۔ اس کی یہ خواہش ہو گی کہ اسی ایک آیت یا حدیث سے وہ تمام تفصیلات جو مطلوب ہیں نکل آئیں۔ حالانکہ قرآن یا سنت کا یہ انداز نہیں۔ بلکہ ہر ہر مسئلہ کیلئے ضاحت و تفصیل کا یہاں ایک مقام ہوتا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں کسی مسئلہ کے تفصیل کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسی مقام پر نظر ڈالی جائے۔ اور یہ دیکھا جائے کہ اس خصوصی میں ہمیں کتاب و سنت کے سرچشمتوں سے کیا ملتا ہے۔ جن لوگوں نے مرزا نیوں سے بحث کی ہے وہ ہماری تائید کریں گے۔ کہ یہ ان کے انداز بحث کا صحیح تحریز ہے۔ یہ لوگ جب حیاتِ مسیح ﷺ کے مسئلہ پر غور کریں گے تو اس انداز سے نہیں کہ اس بحث کی منطقی تsequiat کیا ہو سکتی ہیں؟ اور اس گنجھی کو سلبھانے کیلئے ہمیں کن راستوں پر گامزن ہونا چاہئے اور کتاب و سنت کے کن کن مقامات سے استفادہ کرنا چاہئے؟ بلکہ اس کے برعکس یہ صرف اس پر اکتفا کریں گے۔ کہ اپنے ڈھب کی کچھ آیتیں ڈھونڈ لیں۔ سیاق و سبق سے انہیں علیحدہ کریں اور تاویل و ترجمہ کی تحریفات سے ایسے ایسے معنی پہنچائیں۔ کہ ان کی مطلب براری ہو سکے۔ سنت کے ان مقامات کو یہ چھوڑ دیں گے۔ جہاں اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے یا اصولاً پڑسکتی ہے۔ اور نظر وہاں دوڑائیں گے۔ جہاں سرے سے یہ مسئلہ بیان کرنا مقصود ہی نہیں۔

حیاتِ مسیح ﷺ کی متعلقہ تsequiat

ان کے اس اندازِ استدلال کی مثالیں بہت ہیں۔ اور ان کی تفصیل اتنی دلچسپ

ہے کہ اگر نفسِ موضوع سے ہٹ جانے کا خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ تو میں قطعی بیان کرتا۔ وضاحت کیلئے صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ لگے ہاتھوں آپ حیاتِ مُتّح اللہِ عَزَّ ذَلِیلَہ سے متعلق یہ معلوم کر لیجئے۔ کہ وہ کیا تحقیقات ہیں جن پر روشنی ڈالنی چاہئے۔ اور وہ کیا انداز ہے سوچنے کا جو درست نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔ اور مرزا ای کیونکہ اس انداز سے پہلو تھی کرتے ہیں؟ سب سے پہلے اس کی تاریخی پچھواڑ پر غور فرمائیے۔ کہ یہودی بھی ایک مُتّح کے منتظر ہیں۔ اور عیسائی بھی اس کی آمد ثانی کے قائل اور اس کی زندگی کے معرف۔ اب قرآن کا منصب یہ ہونا چاہئے۔ کہ وہ دونوں کے اس متفقة عقیدے کے مقابلہ میں بتائے کہ اس کی کیا روشن ہے؟ آیا مُتّح اللہِ عَزَّ ذَلِیلَہ کا انتقال ہو چکا۔ یا وہ ابھی زندہ ہیں اور دوبارہ آئیں گے؟

فرض کر لیجئے۔ کہ قرآن کے نقطۂ نظر سے ان کا انتقال ہو چکا۔ جیسا کہ مرزا ای سمجھتے ہیں۔ اگر یہ پوزیشن صحیح ہے۔ تو قرآن کو بڑے صاف لفظوں میں دونوں اس رائے کا اظہار کر دینا چاہئے۔ اس لئے بھی کہ اس سے ایک تاریخی نزاع کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن صورتحال یہ ہے کہ یہ مسئلہ جس ڈھنگ سے قرآن میں مذکور ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہرآئینہ استدلال کا مسئلہ ہے۔ اب وہ صحیح ہو یا غلط اس سے بحث نہ کیجئے۔ اس پر غور فرمائیے گا۔ نص صریح کا کسی صورت میں بھی نہیں یعنی ثبوت کا مزاج استدلالی ہے۔ جو بحث و نزاع کا ہدف ہو سکتا ہے۔ ایسا واضح نکھرا ہوا اور متعین نہیں۔ کہ اس میں اختلاف کیلئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ یہ بر سیل تنزل ہے۔ ورنہ ہماری رائے میں ان کی زندگی سے متعلق اشارات اس سے کہیں زیادہ واضح ہیں۔ اس نکتہ کے فہم پر اگر مناظرانہ تجھ نظری قادر نہ ہو تو اس تنقیح

— مرازائیت نے زادیوں سے —

پر غور فرمایا جائے۔ کہ عیسائیوں کے نقطہ نظر سے حضرت مسیح ﷺ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں۔ اب اگر حضرت مسیح ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے۔ تو یہ اس عقیدہ پر ایسی براہ راست چوت ہے۔ جس کی سہار عیسائیت میں بالکل نہیں۔ لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ سارے قرآن میں ایک جگہ بھی وفاتِ مسیح کو بطور ابطال الہیت مسیح کے پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن حکیم جب یہ بتانا چاہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ﷺ کی نہیں ہیں تو وہ دور کے لوازم کا تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے:-

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلْقَةٌ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ
كُنْ فَيَكُونُ (آل عمران: ۵۹)

مسیح کی مثال عند اللہ ایسی ہے جیسے آدم ﷺ کی کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کن فیکون کہا،۔ کبھی فرماتا ہے:-

آنِي يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ لَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبٌ (الانعام: ۱۰۱)
اللہ کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس کی جورو ہی نہیں،۔
کبھی ارشاد ہوتا ہے۔

كَانَا يَأْكُلُانِ الطَّعَامَ (المائدہ: ۷۵)

مسیح اور اس کی ماں تو کھانے کی احتیاج بھی محسوس کرتی تھیں،۔

اور یوں نہیں فرمادیا کہ عیسائیوں اتم کس پھیر میں ہو جو مر چکا وہ خدا کیونکر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ قرآن کے اسلوب بیان کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ جب وہ اعتراض کرتا ہے تو ایسی پوزیشن اختیار کرتا ہے۔ جو زیادہ مضبوط ہو۔ اور اس باب میں اس کو آخری پوزیشن یا فیصلہ کن پوزیشن قرار دیا جاسکے۔ مسیح ﷺ کا آدم ﷺ کی طرح ہوتا یا اللہ

کی جو روشنہ ہونا یا مسح اللطیفۃ یا آن کی ماں کا کھانا کھانا اعتراضات تو ہیں۔ لیکن فیصلہ کی جو طاقت اس دار میں ہے کہ مسح اللطیفۃ کا انتقال ہو چکا ہے وہ ان میں بالکل نہیں۔ لہذا اگر قرآن نے وضاحت کی یہ پوزیشن اختیار نہیں کی تو لامحالہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن کے نقطۂ نظر سے مسح اللطیفۃ کی موت متفق نہیں ورنہ وہ کبھی اس اعتراض سے نہ چوکتا۔

کیا مناظرہ جنگ ہے؟

وفات مسح اللطیفۃ کا مسئلہ اس وقت موضوع بحث نہیں۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ سمجھانا یہ مقصود ہے۔ کہ مناظرانہ کج بھی کیونکر اصابت فکر سے روکتی ہے اور کس طرح واضح اور فیصلہ کن متعلقات کو نظروں سے او جھل رکھتی ہے۔ نوک جھونک اور دلائل و براہین کی نمائش اور بات ہے۔ اور حقیقت تک رسائی بالکل دوسری شے۔ جن لوگوں نے مناظروں کو دیکھا ہے۔ اور سنایا ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ فریقین کس طرح بحث میں ایک دوسرے کو ال جھاتے ہیں۔ حیرت و پریشانی کے کیا کیا سامان پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور کس کس انداز میں مخالف کی سادگی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کس طرح غلط بیانی کی جاتی ہے؟ اور اسے الحرب خدعاً کہہ کر جائز ٹھہرایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سرے سے حرب ہی نہیں۔ یہاں تو غرض افہام و تفہیم ہے۔ یعنی اپنی بات سمجھانا اور دوسرے کی سمجھنا مقصود ہے۔ لیکن وہ اس اعتبار سے اسے حرب کہنے میں حق بجانب ہیں کہ فریقین کی نفیات مناظرہ میں واقعی اس طرح کی ہو جاتی ہیں۔ گویا باہم خصم اور مخالف ہیں۔ مشا ایک دوسرے کو پچھاڑنا ہے اور شکست دینا ہے سمجھانا نہیں۔

مناظرہ اور دعوت کے تقاضے جدا جدابیں

جب مناظرہ کی غرض و غایت یہ قرار پائے۔ کہ مخالف پر کیونکر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ تو اس کا مزاج دعوت دینی کے مزاج سے بالکل مختلف تھہرے گا کیونکہ دین تو یہ چاہتا ہے۔ کہ خطاب میں ایسی مؤثریت ایسی شیرینی ایسی مٹھاس اور جاذبیت ہو کہ سننے والا اثر قبول کر کے رہے۔ اور مناظرہ کے تیوار اس بات کے مقاضی ہوں گے کہ اس میں جنگ کا دم خم ہو۔ جنگ کا سادا دعا اور لکار ہوا اور جنگ ہی کی طرح کا اندازِ گفتگو ہو۔ مذہب و مناظرہ بظاہر اگرچہ حلیف و دوست معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ان کے راستے جدا جدابیں۔ مذہب کے معاملہ میں بسا اوقات ہار جانا فتح کے مترادف ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی غلطی نہ صرف یہ کہ تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ بلکہ غلطی پر متنبہ کرنے والے کاشکریہ ادا کیا جاتا ہے اور مناظرہ ہمیشہ معصوم ہوتا ہے اس سے یا تو کبھی لغوش سرزد ہی نہیں ہوتی۔ اور یا پھر اس لغوش کا اخفاء ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ مخالف تو داعی کی نسبت سے ہوا۔ وہ شخص جس کو آپ کسی دینی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر مناظرہ کا ذسا ہوانہیں ہے تو نہایت توجہ سے آپ کی باتوں کو سنبھالنے گا۔ اور پوری شکر گذاری کے ساتھ ان کی پذیری ائمی کرے گا۔ لیکن اگر وہ ایسی طبیعت نہیں رکھتا۔ اور اس کے دل و دماغ پر بحث کا لگ لگ چکا ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ دل کی صحت رخصت ہو چکی۔ وہ آسانی سے ماننے والا نہیں بات بات پر یہ کو سے گا اور ایسی میں تنخ نکالے گا۔ کہ آپ پر بیشان ہو جائیں گے۔

مناظرہ اور تبادلہ خیال میں فرق

اس غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ کہ تبادلہ خیالات کو ہم مناظرہ سے تعبیر نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ جب تک دنیا میں فہم و فکر کے پیانے مختلف رہیں گے۔ تبادلہ خیالات کی ضرورتوں کو برابر محسوس کیا جائے گا۔ کیونکہ رفعِ نزع اور رفعِ اختلاف کی اور کوئی صورت بجز اس کے ہمارے ذہن میں نہیں آتی۔ کہ دو معقول آدمی بینھ کر گفتگو سے معاملہ کو سلحوں میں۔ یا باہمی افہام و تفہیم سے ایک دوسرے کو قائل معقول کر لیں۔

ہم جس چیز کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور جس یہماری کو اصابت فکر کے لئے مہلک سمجھتے ہیں وہ مناظر انہ ذہنیت ہے۔ مجادلہ بالاحسن تو وظیفہ انبیاء (علیہم السلام) ہے یعنی ایسے طریق اور ڈھب سے اپنے مقصود کو پیش کرنا جو مخالف کے نقطہ نظر سے بھی معیوب نہ ہو خالص پیغمبرانہ صفت ہے۔ ایک باریک اور حکیمانہ فرق مناظر اور داعی میں یہ ہے کہ مناظر کی زد میں صرف دلائل و اعتراضات کا ایک انبوہ ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ مخالف پر قابو پانے کیلئے ایک طرح کی اخلاقیت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن داعی دلائل کو اتنا ہم نہیں سمجھتا۔ جتنا کہ اخلاقیت کو درخور اعتنا قرار دیتا ہے۔

یوں سمجھتے کہ مناظر کے سامنے صرف فنِ مناظرہ اور اس کے تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ رشید یہ کہ ہر ہر حرف کی پابندی کا الترام کرتا ہے۔ لیکن اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جو اس کی لوحِ دل پر مرتم ہے۔ اس کے برعکس ایک داعی یہ دیکھتا ہے۔ کہ مخاطب میں رشد و ہدایت کے دو ائمہ کیونکر بیدار ہو سکتے ہیں۔ پھر اگر وہ محسوس کرتا ہے۔ کہ یہاں دلائل کے پیچھے بھاگنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ تو وہ نفس

مخاطب کا تعاقب کرتا ہے اور نقض و معارضہ کی راہوں کو چھوڑ کر استدلال کی ایسی راہیں اختیار کرتا ہے۔ جو سیدھی اس کے دل تک پہنچتی ہیں۔ حضرت ابراہیم ﷺ کو دیکھتے کہ نمرود سے بحث کرتے وقت جب یہ دیکھتے کہ اس دلیل سے ”رَبِّيَ الَّذِي يُخْبِي وَيُمِيَّزُ“ (البقرہ: ۲۵۸) ”میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا اور مراتا ہے“ اس کی تسلیکین نہیں ہوتی..... تو اس دلیل پر اس کو جو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا ازالہ نہیں فرماتے۔ بلکہ آسانی فہم کیلئے ایک اور مشاہدہ عبرت اس کے سامنے پیش فرمادیتے ہیں۔ کہ اچھائی نہیں نہ سہی۔ اس دلیل پر غور کرلو! ”فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأَتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ“ (البقرہ: ۲۵۸)

”اللَّهُ تَوَاضَّعَ قَدْرَتِ كَالْمَدَ سَآفَابَ كَوْمَشْرَقَ سَنَكَالَتَ“ ہے۔ تم بھی اگر اس کارخانہ پر قابو رکھتے ہو تو یہ سمت بدل دو۔

ظاہر ہے۔ دوسری دلیل پہلی دلیل سے کچھ قوی نہیں ہے۔ اور نہ پہلی دلیل ایسی غیر واضح ہے۔ کہ اس پر نمرود کے اعتراض کو صحیح سمجھا جائے۔ تاہم حضرت ابراہیم ﷺ نے مناظرہ کی منطق سے پہلو تہی کی اور تفہیم کا دوسرا انداز اختیار کیا۔ ہم جو مسائل کے فہم میں یہ سمجھتے ہیں۔ کہ پہلے مناظر انہا اثرات سے دماغ کو پاک کر لیا جائے۔ تو یہ بالکل وہی حقیقت ہے جسے قرآن ”شہادت قلب“ سے تعبیر کرتا ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ (ق: ۳۷)

”اس میں یقیناً نصیحت کی بات ہے۔ لیکن اس شخص کے لئے جس کے پہلو میں دل ہے یا جو وجہ سے متباہ ہے اور اس کا دل اس پر شاہد ہے۔“

کیونکہ اگر پہلے ایک رائے قائم کر لی گئی ہے۔ تو پھر یہ ناممکن ہے کہ جانچ پر کھ کے اصولوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہو سکے۔ نزاعی مسائل میں بالخصوص جب کسی فیصلہ پر پہنچنا مقصود ہو۔ ذہن کو اس تحریر یہی سطح پر لے آنا چاہئے کہ گویا پہلی دفعہ آپ ایک موضوع پر غور کر رہے ہیں۔ اور کوئی سابقہ تعجب یا پہلا عقیدہ آپ کے آزادانہ غور و فکر میں حائل نہیں۔

ہرشے کے دو مزاج ہوتے ہیں

طبیب ممکن ہے اس حقیقت کو نہ مانیں۔ مگر یہ ایک سچائی ہے کہ ہر دوا کا مزاج دو ہرا ہوتا ہے۔ ایک مزاج وہ ہوتا ہے جو ہر ہر دوائیں قدرت نے پہاڑ رکھا ہے۔ اور ایک مزاج وہ ہے جو دواؤں کے ساتھ ملانے سے ابھرتا ہے۔ یعنی بخشہ کی ایک خصوصیات وہ ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ بخشہ ہے۔ اور کچھ نئے اثرات اور نئی کیفیات ہیں۔ جو دوسری دواؤں کے ساتھ ملنے سے اس میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ مفرد و مرکب کے مزاج خصوصیات کا اختلاف اتنا واقعی اور حقیقی ہے کہ اس میں قطعاً اختلاف کی گنجائش نہیں۔ بسا اوقات مختلف ادویہ کو باہم ملانے اور آمیخت کرنے سے اس طرح کا ایک نیا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اور نئی نئی خصوصیات ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ خود طبیب حیران رہ جاتا ہے۔

طبیعت کی ایک مثال

اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کیلئے طبیعت کے اس عام مسئلہ پر غور کیجئے۔ کہ آسمیجن اور ہائیڈروجن دو گیسیں ہیں۔ جن کو اگر علیحدہ علیحدہ دیکھا جائے تو

کہیں نبی کا نشان نہیں ملتا۔ یعنی اگر تجربہ یہ نہ بتاوے۔ کہ دونوں کے باہم ملنے سے پانی معرض ظہور میں آتا ہے۔ تو صرف ان دونوں کا الگ الگ مطالعہ اس نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ دونوں کا مزاج اپنی طبعی خصوصیات کی وجہ سے پانی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ دونوں بہرآئینہ گیسیں ہیں۔ جن میں مائیت کی بجائے آتش پذیری کی صلاحیتیں زیادہ نہایاں ہیں۔

مکانگی ثبوت

اسی اصول کو مکانگی انداز سے دیکھئے کہ ایک مشین ایک انجن اور کل پرزوں کا بہت بڑا مجموعہ اس کا ایک وظیفہ ہے۔ اور وہ جن پرزوں پر مشتمل ہے۔ ان کا اپنا علیحدہ علیحدہ ایک کام ہے۔ اگر ایک شخص ریڈیو کے بکھرے ہوئے اجزاء کو دیکھتے تو وہ کسی ایک پرزے کو دیکھ کر یہ پیشین گولی نہیں کر سکتا کہ یہی جب دوسرے اجزاء سے مشین میں جڑے گا تو اس میں سے نغمہ و موسیقی کے چشمے ایلنے لگیں گے۔ بھاپ بظاہر کتنی بلکی شے ہے لیکن یہی ترتیب پا کر اور دوسرے کل پرزوں سے مل کر بڑے بڑے انجنوں کو بلکی کسی رفتار سے حرکت دیتی اور چلاتی ہے۔

حسن کی حقیقت

جمالیات میں بھی یہی اصول کا فرماء ہے۔ یہاں بھی حسن کا مفہوم یہ نہیں کہ لذت نظر کا پورا پھیلا و جسم کے ایک ہی حصہ میں سمٹ آیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ ایک بالکل نئی حقیقت ہے جو مختلف حقیقوں کے امتزاج و ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی صرف کاکل و گیسو کا پیچ و خم ہی اسے معرض ظہور میں نہیں لاتا۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی

شرط ہے۔ کہ اس کا تعلق ایک حسین چہرہ سے بھی ہو پھر وہ حسین چہرہ بھی تنہا کوئی نہیں جب تک ایک براق اور صراحی دار گردن نے اسے نہ تحام رکھا ہو۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ پھر اس گردن کو بھی اس طرح کا ہونا چاہئے۔ کہ جب نظر اس سے پھسلے تو ایسی جگہ جا کر رکے کہ اس رکاوٹ کے بعد دنیا کی اور کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ پھر نظر اور خیال کی بھی کوئی آخری رکاوٹ نہیں اور کئی چیزیں جو نظر کے دامن کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، مسکراہیں ہیں، انگڑائیاں ہیں، چال ہے، ادا میں ہیں اور خدا جانے کیا کچھ ہے؟ غرض یہ ہے کہ ان میں ایک ایک چیز کا علیحدہ علیحدہ اگر آپ تصور کریں گے تو ان میں کوئی کشش اور جاذبیت نظر نہیں آئے گی لیکن جب ان سب کی مجموعی فوج تیار ہو گی، تب فتوحات کی وسعتوں کے کیا کہنے۔

یہ حسن جونغمہ و شعر میں مضر ہے کہاں سے آیا ہے؟ محض حسن امتزاج ہی تو ہے۔ کہ ایک عمدہ سے عمدہ شعر جو آپ کو تزیپ دیتا ہے۔ اور وجد طاری کر دیتا ہے وہ جن الفاظ اور تراکیب پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کو الگ الگ بزاروں مرتبہ ہم پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا ذہن کبھی متاثر نہیں ہوتا۔ پھر جب ایک صاحب فن ان الفاظ کو لے کر سلیقے سے ترتیب دیتا ہے۔ تو اس میں بالکل نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ حقیقت ہے کہ اگر ہماری سائنس اتنی ترقی کرے کہ وہ نغمہ کا نحیک نحیک تحریک کر سکے۔ تو وہ آپ کو یہ بتا سکے گا کہ وہ راگ جو آپ کیلئے لذت گوش کا سامان بھم پہنچاتا ہے درحقیقت ایسی آوازوں کا مجموعہ ہے۔ کہ جن کو اگر آپ الگ سن پائیں تو بے تو جہی یا انگرت سے منہ پھیر لیں۔

استدلال و استنباط کا معاملہ

غرض یہ ہے کہ ہر شے کے دو مزاج ہوتے ہیں۔ ایک جب وہ تھا ہو۔ اور ایک جب وہ دوسری چیزوں کے ساتھ ملے۔ نہیک اسی طرح فکر و استدلال کا معاملہ ہے۔ یہاں بھی ایک حقیقت یا مفہوم وہ ہے۔ جو ایک آیت یا ایک حدیث میں منفرد انہ کو رہے اور ایک اس کی وہ جامع اور واضح شکل ہے جو کتاب و سنت کے دفاتر و ابواب میں مختلف پہلو اور پیرایہ ہائے بیان میں مستور ہے۔ ان دونوں میں وضاحت تعین کا جو فرق ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ یہ قطعی ممکن نہیں کہ ایک مسئلہ اپنے طبعی پھیلاو کے ساتھ کسی ایک جگہ اس انداز سے آ جائے۔ کہ کوئی پہلو اجمال کا اس میں نہ رہے یا کوئی غلط تاویل نہ پیدا ہو سکے یا کسی شک وطن کی گنجائش نہ نکل سکے۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن و حدیث کا مسائل کے باب میں یہ انداز خاص ہے جو بالکل فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ کہ ایک مقام پر صرف انہی حقیقوں کا اظہار ہو۔ جن کا اظہار وہاں مقصود ہے۔ قرآن و سنت کا انداز بیان فقہ و قانون یا انسانی فنون سے مختلف ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف چند اصول ہی نہیں جن کو سمجھانا مقصود ہے۔ پوری انسانی زندگی ہے پورا معاشرہ ہے زمانہ کا ایک مخصوص ذہن ہے۔ وقت کے رسم و رواج اور تصورات و عقائد ہیں۔ آنحضرت ﷺ مکلف ہیں کہ ایک خاص مرتبہ اور ترتیب سے ان تک اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائیں اور خاص ذہب سے ان کی ترتیب فرمائیں۔ اس لئے وہاں ترتیب مسائل کا وہ ذہب قدر نہیں ہو سکتا جو ہم کو فنون کی کتابوں میں ملتا ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف فن اور اس کے متعلقات ہیں اور آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک قوم ہے جس کی اصلاح کی ایک خاص رفتار ہے۔ اس لئے قرآن و سنت

کی ہدایت و نصوص اس تاریخی رفتار کے دوش بدش چلتے ہیں۔

ایک نکتہ

یہی وہ نکتہ ہے جس پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں نے قرآن حکیم میں از راہ تکلف ربط آیات کی تلاش شروع کر دی۔ اور قرآن کو بھی ایک انسانی کتاب بنانا چاہا۔ جس میں ترتیب و بیان کا وہی انسانی ڈھنگ ہے۔ گویا وہ بھی ایک فن ہے۔ اور اس میں بھی وہی ترتیب و ربط ہے۔ جو فن کی دوسری کتابوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ کتاب و سنت ایک قوم کی ترتیب کا عملی و علمی ریکارڈ ہے۔ اس میں جو ترتیب ہے وہ تاریخی ہے۔ واقعات کی ہے۔ مسائل و مضامین کی ہے۔ اس انداز کی نہیں کہ آپ ایک ایک آیت کو ماقبل سے متصل ہو جڑا ہوا پائیں۔

دوسرہ مقدمہ

اس لئے قدرتاً دوسرہ مقدمہ یا اصول فہم مسائل، جس کا مرعی رکھنا ضروری ہے یہ ہو گا۔ کہ جب کسی مسئلہ پر غور کریں۔ بشرطیکہ وہ مسئلہ اہم اور بنیادی بھی ہو۔ تو اس کے پورے متعلقات کو بیک وقت زیر نظر لائیں۔ کتاب و سنت میں تنفس اور تلاش سے ایسے مقامات کا پتہ لگائیں۔ جہاں اس مسئلہ کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ سب تعلقات مل کر ایسی مکمل اور جامع اور ایسی واضح اور روشن تصویر آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ کہ اتنی وضاحت و جامعیت سے وہ کسی ایک جگہ نہیں مل سکے گی۔ یعنی دلائل و مovidات کے پورے پھیلاو کو پہلے اپنے سامنے لایے۔ پھر یہ دیکھئے کہ اب آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ یقیناً اس طرح کا یہ تاثر اس تاثر سے بالکل مختلف ہو گا۔ جو

اس ترتیب کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یوں ایک شب جو ایک جگہ ابھرتا ہے۔ دوسری جگہ زائل ہو جائے گا۔ یعنی اگر ایک مخصوص وضاحت ایک آیت میں آپ کو نہیں ملے گی۔ تو وہ دوسرے انداز سے دوسری جگہ مل جائے گی یہی حال احادیث کا ہے۔ کہ ان کو ساتھ ساتھ رکھنے سے شک و شبہ کی تمام گنجائشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں مسئلہ کی لغوی اور ادبی تصریحات کی بھی چند اس ضرورت نہیں رہے گی۔ اور یفسر بعضہ بعضاً کا منظر آپ کے سامنے آئے گا۔ کہ جس سے کامل انتراح صدر کے موقع ملیں گے۔ اس سلسلہ میں مناظروں کا عالمہ الورود دھوکہ یا گھپلا یہ ہوتا ہے کہ اس تاثر کو وہ زائل کریں جو تصوری کے پورے رخوں کو دیکھنے سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی ایک ذاکو کی طرح جو بھیڑ اور بجوم سے بچتا ہے۔ اور اکے دے کے مسافر پر حملہ کرتا ہے۔ یہ صرف ایک ایک آیت کو بحث کے لئے چلتے ہیں۔ اور ایک ایک حدیث کو مجموعی تاثر سے الگ کر کے حملہ آور ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن میں چونکہ مسئلہ کے تمام پہلو نہیں رہتے۔ اس لئے کمزور عقل اور تھوڑے علم کا آدمی آسانی سے ان کی تاویلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

تیرا اصول

فکر و استدلال کی گاڑی کو کامیابی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے اس مقدمہ کی رعایت بھی ضروری ہے۔ کہ دعویٰ اور دلائل میں خصوص و تعین کی مناسبت کا خیال رہے۔ یعنی جس درجہ دعویٰ میں تعین اور تحدید ہے۔ اسی طرح دلیل کو بھی معین و خاص (Specific) ہونا چاہئے ورنہ یہ اندیشہ لاحق رہے گا۔ کہ مدعی و محیب دونوں اپنی ہانکر رہیں۔ اور تنقیح طلب نکات بدستور تشنہ ہی رہیں۔

فلکرو استدلال کی عام لغزش

روادمناظرات میں یہ مغالطہ عام ہے ہر مناظر دعویٰ تو کرتا ہے۔ ایک لگے بند ہے اور پنے تلے عقیدے کا۔ اور دلائل ایسے پیش کرتا ہے۔ کہ جن کے مزاج میں عموم تو ہوتا ہے۔ مگر وہ کلیت نہیں ہوتی۔ ہر ہر فرد پر جس کا اطلاق بلا محابا ہو سکے اور نہ وہ تعیین و خصوص ہی ہوتا ہے۔ کہ جس سے دعویٰ ثابت ہو سکے۔ موضوع زیر بحث میں جہاں جہاں اس انداز کے دھوکے اور گھپلے آئے ہیں۔ میں ان کی چہرہ کشائی نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان کی وضاحت تو اپنے مناسب مقام پر ہو گی۔ سر دست دوسری طرح کی مثالوں سے اس کو تبھی کی کوشش کیجئے۔

ایک مثال

متحده ہندوستان میں دو سیاسی تنظیمیں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کیلئے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک کانگرس تھی۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ پیش پیش تھے اور دوسری جانب مسلم لیگ تھی جس کی عنان قیادت مرحوم قائد اعظم محمد علی جناح کے ہاتھ میں تھی۔ مولانا کے حامی یہ کہتے تھے کہ انگریزی دان حضرات کو اسلامی مزاج سے کیا مناسبت؟ اور لیگ سے وابستہ اس الزام کا یوں جواب دیتے تھے کہ یہ مانا ابوالکلام آزاد بڑا دقتہ رس عالم ہے مگر یہ سیاست کا خارزار ہے۔ یہ قال اللہ و قال الرسول ﷺ کہنے والے کیا جائیں کہ یہاں کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟ استدلال کی غلطی دونوں جانب یہ تھی کہ یہ بحث کرنے والے یہ بھول جاتے تھے کہ متنازع فیہ کوئی عالم دین نہیں بلکہ ابوالکلام

ہے جس کی جامعیت اور سیاسیات میں بصیرت و رسوخ کا لوبہ بڑوں بڑوں نے مانا ہے۔ اسی طرح سوال صرف کسی مسٹر کا نہیں محمد علی جناح کا ہے جو ہو سکتا ہے دین کی جزئیات کو اتنا نہ جانتا ہو جتنا ایک عالم دین جانتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے اس کی شبانہ روز کی زندگی کا معمول اس انداز سے مختلف ہو۔ جو عام مسلمان کا ہو سکتا ہے لیکن اتنا تو بہرآئینہ مسلم ہے کہ اس کی دعوت کی بنیاد دو قوموں کے جس عقیدہ پر تھی وہ عین اسلامی انفرادیت کا تقاضا تھا۔ غرض یہ نہیں کہ دونوں کو حق بجانب تھہرا یا جائے یا دونوں کی غلطی پکڑا یہی جائے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ دونوں گروہوں کے طرز استدلال میں جو منطق غلطی تھی وہ یہ تھی کہ ان کا دعویٰ تو مخصوص اور معین تھا لیکن دلیل کی بناوٹ میں عموم کو زیادہ دخل تھا۔ یعنی ثابت وہ یہ کرنا چاہتے تھے کہ ابوالکلام عالم و فضل کی جلالت شان کے باوجود سیاسیات میں کورے ہیں اور دلیل وہ یہ لاتے تھے کہ عام علماء کے دائرہ معلومات میں سیاسیات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی اسی طرح دوسرا فریق جواباً کوشش یہ کرتا تھا کہ قائد اعظم کی دین سے متعلق عام لاعلمی کا غلط استعمال کرے حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اگر کسی شخص نے اسلامی فنون کو نہیں پڑھا تو وہ اسلام کے متعلق ایک بدیہی اور جانی پہچانی حقیقت سے بھی ناواقف ہے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام ایک الگ ثقافت ہے اور اسلامی قومیت کی بنیاد علیحدہ اور ممتاز عقیدے کی نیوپر استوار ہوتی ہے۔

اب یہ الگ بحث طلب اور دقيق مسئلہ ہے کہ اسلامی قومیت کا دائرہ کسی دوسرے ثقافتی و ملٹنی دائرے سے بھی کہیں ملتا ہے یا نہیں یا اس کے ملنے اور الگ رہنے کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ یہاں اس گنجی کو سمجھانے کا کوئی موقع نہیں غرضیکہ

فریقین نے اثباتِ مدعای کے لئے جو ڈھنگ استعمال کیا اس میں کیا منطقی خامی تھی۔

دوسری مثال

اسی طرح ایک گھپلا وہ ہے جو عام الحاد پسند عناصر کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ دلیل کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی نظر میں چونکہ مادیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ اصلیٰ حقیقت شے روحا نیت ہے اس لئے وہ دینی قدروں سے بحث ہی نہیں کرتا یہی نہیں بلکہ وہ طبائع کو ایسے رخ پر ڈالتا ہے کہ جو تعمیر و تدن کے یکسر منافی ہوتا ہے۔ یعنی ایک مذہبی آدمی کی نفیات اس طرح کی ہو جاتی ہے کہ وہ آخرت کو اتنا اہم سمجھتا ہے کہ یہاں کی ہر ہر لذت اس کی نظر وہ میں ہے۔ وہ بھوک کی ہر تکلیف اور جھانجھ کو اس موقع پر برداشت کر لیتا ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ آسمانی بادشاہت میں جو نعمتیں اس کے دستِ خوان پر چھپی جائیں گی وہ ان سے کہیں عمدہ ہوں گی۔ اس کی ساری کوشش اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ کسی طرح یہ نفس امارہ ختم ہو جائے۔ اگرچہ اس کے ختم ہونے سے زندگی کی یہ ساری آرزوئیں ہی کیوں نہ مٹ جائیں۔ اس کا ذہنی برتاؤ دنیا کے بارے میں ہمدردانہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے مذہب کے باب میں یہ تجزیہ یہ عیسائیت اور ہندو مذاہب کے اعتبار سے تصحیح ہے کہ ان کے ہاں رہبا نیت اور تیاگ بنیادی عقیدہ ہے۔ ہندو مذہب کے نقطہ نظر سے یہ ساری کائنات متحہ یا باطل ہے۔ اس لئے اس کے تقاضے اور مطالبے بھی درخواست نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح عیسائیت کے خیال سے اصلیٰ و حیقیقی زندگی صرف وہ ہے جس کا آغاز موت کے بعد ہو گا۔ دنیاوی اور جسمانی زندگی کو وہ یک قلم گناہ اور معصیت کی زندگی قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے نجات

کے لئے وہ ان اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے جو اس جسم کے ساتھ اس دنیا میں رونما ہوتے ہیں کیونکہ وہ عمل جو جسم کی آلودگیوں سے کسی طرح الگ نہیں ہے پاک کیونکر شہرے گا۔ ان کے نزدیک نجات کا اختصار اعمال پر نہیں کفارہ پر ہے لیکن اسلام کا مزاج اس ذہنیت سے بالکل مختلف ہے وہ تموت سے پہلے کی زندگی میں اور آخرت عقبی کی زندگی میں کوئی خط امیاز نہیں کھینچتا بلکہ اس کے نزدیک تو یہ پہلی زندگی دوسرا زندگی کی تمہید یا نتیجہ ہے۔ اسلام جس عقیدے کی تلقین کرتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا اگرچہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے شہراو کی جگہ نہیں تاہم اس کے فرائض و واجبات میں جن سے ادنیٰ تغافل بھی رہبانتی ہے۔ یہاں رہنے اور یہ سن کی کچھ شرائط ہیں جن کو بہرآئینہ ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اسلام تمدنی ارتقاء میں پورا پورا حصہ دار ہے۔ ایک مسلمان کی بہترین آرزو اس کے نزدیک بھی ہے کہ وہ وقفا عذاب النار سے پہلے حسن دنیا کا طالب ہو کہ عروض دنیا کے گیسوئے پیچیدہ کو اگر سل جھالیا گیا تو آخرت کا مسئلہ آسان ہے۔ جسم ناپاک نہیں یہ دنیا اور اس کی فطرت بھی گناہ و معصیت سے آبودہ نہیں بلکہ ارادہ و شعور اور عمل کے خاص نقشے یا چوکھے اسے ناپاک یا پاک شہراتے ہیں غرضیکہ جب اسلام کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہو تو اسے مجملہ دوسرے مذاہب کے ایک مذهب قرار دینا اور پھر ترقی کی راہ میں منع سمجھنا منطقی غلطی ہے۔

تنبیہہ کی ضرورت

یہ اصول منطق میں نہایت پیش پا افتادہ ہے کہ جب دعوی خاص ہو تو اس کے ثبوت میں دلیل کو بھی خاص اور متعین ہونا چاہئے لیکن اگر آپ مباحثات کا جائزہ لیں گے تو وہ دینی ہوں یا سیاسی ان میں اسی مغالطہ کو زیادہ جاری و ساری پائیے گا کہ دعوی و

دلیل میں باہم مناسبت نہیں۔ ایک کامراج متعین ہے اور دوسرا غیر متعین، عموم کا رنگ لئے ہوئے اس لئے اس پر تنبہ ضروری تھا کیونکہ آئندہ تفصیلات میں اور مخالفانہ انداز بحث میں بار بار اسی غلطی کا ارتکاب دیکھئے گا۔

خلاصہ بحث

ان مقدمات کی وضاحت کے بعد اب ہم اس موزیک پہنچ گئے ہیں جہاں سے نفس موضوع کا آغاز ہونا چاہئے اب تک جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا شخص یہ ہے کہ مسائل کے فہم کے لئے سب سے پہلے ذہن کا صاف ہونا ضروری ہے۔ بالخصوص مناظرانہ کج بخشی سے جو غور و فکر کی صلاحیتوں میں ایک طرح کا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور تنگ نظری اور چھپھور پن سے جو اس کا منطقی نتیجہ ہیں بچاؤ لازمی نہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت ایک مرتبہ اس کے مجموعی چوکھے پر نظر ڈال لی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ دلائل و شواہد کے اس انبار سے خود بخود کیا اثرات ذہن پر مرتمم ہوتے ہیں اور دلائل کی جھان بین میں اس لغزش پر خصوصیت سے نظر رہے کہ دعویٰ و دلیل میں باہم تطابق بھی ہے یا نہیں؟۔ آئیے ختم نبوت کے سلسلہ میں جن آیات و احادیث کو پیش کیا جاتا ہے پہلے بغیر کسی بحث میں الجھے اور بغیر کسی تنقیح میں پڑے ہم یہ دیکھ لیں کہ بحیثیت مجموعی ان سے عقیدہ کے کون کون پہلو روشن ہوتے ہیں اور تصویر کے کون کون رخ سامنے آتے ہیں۔ یعنی ہمارا ذہن بغیر کسی جانبداری کے اور ہماری عام سمجھے بوجھ بغیر کسی مناظرانہ دخل اندازی کے آپ سے آپ کن کن حلق کو بھانپ لینے میں کامیاب ہوتی ہے۔

مختصر حکایت

آیات و احادیث کے حقائق

- آیات _____ ○
- احادیث _____ ○
- ان دلائل کی وضاحت _____ ○
- ایک حقیقت کا واسطہ اعتراف _____ ○
- لغت کی حقیقت _____ ○
- فن تفسیر کا اعجاز _____ ○
- لغت ایک تاریخ _____ ○
- تفسیر اور مسخرخ میں فرق _____ ○
- جست جست جو اے _____ ○
- جربیانِ نبوت کے دلائل کی نوعیت _____ ○
- کیا خاتم کے معنی افضل کے ہیں ؟ _____ ○
- جواب کی دو صورتیں _____ ○
- ایک جانے کی بات _____ ○
- حضرت عائشہؓ کا قول _____ ○
- محبت صرف کتاب اللہ اور سنت _____ ○
- نظر کی کچی _____ ○
- نبوت کا اطلاق _____ ○
- نبوت و ولایت میں فرق _____ ○
- اجراء نبوت پر کتنے آیات سے _____ ○
- استدلال کیا جا سکتا ہے _____ ○

آئے ختم نبوت کے سلسلہ میں جن آیات و احادیث کو پیش کیا جاتا ہے پہلے بغیر کسی بحث میں الجھے اور بغیر کسی تشقیح میں پڑے ہم یہ دیکھ لیں کہ بحیثیت مجموعی ان سے عقیدہ کے کون کون پہلو روشن ہوتے ہیں۔ اور تصویر کے کون کون رخ سامنے آتے ہیں۔ یعنی ہمارا ذہن بغیر کسی جانبداری کے اور ہماری عام سمجھ بوجھ بغیر کسی مناظرانہ دخل اندازی کے آپ سے کن کن نق کو بھانپ لینے میں کامیاب ہوتی ہے۔

آیات

آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِجَالِكُمْ وَلِكُنْ رَسُولَ اللَّهِ
وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب: ٤٠)

”لوگو! محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ (تو زید کے کیوں ہوں؟) وہ تو اللہ کے رسول ہیں۔ اور (خطوں کی مہر کی طرح سب پیغمبروں کے آخر میں ہیں،۔۔۔

ساری کائنات کی طرف

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سباء: ٢٨)

”اور (اے پیغمبر ﷺ) ہم نے تم کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا ہے کہ ان کو ایمان لانے پر خوشخبری سنادا اور کفر ہونے پر ہمارے عذاب سے ڈرا دو، مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔“

سارے تقاضے پورے ہو چکے

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَّتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيَتُ لَكُمْ
الإِسْلَامَ دِينًاً (المائدۃ: ۳)

”اب ہم تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور ہم نے تمہارے لئے اسی دین اسلام کو پسند فرمایا۔“

تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ
نَذِيرًا“ (الفرقان: ۱)

”وہ ذات با برکت ہے۔ جس نے اپنے بندے پر قرآن اشارتا کر کے تمام کائنات انسانی کیلئے وہ ڈرانے والا ہو۔“

احادیث

قصر نبوت کی آخری اینٹ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِي
وَمَثَلُ الْأَنْبِيَاءِ كَمَثَلِ قَصْرٍ أَحْسَنَ بُنْيَانَهُ تَرَكَ مِنْهُ مَوْضِعَ لِبَيْنَهُ
فَطَافَ بِهِ النَّظَارُ يَتَعَجَّبُونَ مِنْ حَسْنِ بَيْنَانِهِ إِلَّا مَوْضِعُ تِلْكَ الْبَنَةِ

فَكُنْتَ أَنَا سَدِّيْثٌ هُوَضِعَ الْبِنَةَ خُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانِ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلِ وَ
فِي رَوَايَةِ فَانَا الْبَنَةَ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ (بخاری و مسلم)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری اور انبیاء علیہم السلام کی مثالیوں ہے جیسے ایک ہولی ہوجھے کارگروں نے نہایت عمدگی سے تیار کیا ہو۔ صرف ایک اینٹ کے برابر اس میں رخنہ چھوڑ دیا گیا ہو دیکھنے والے گھوم پھر کراسے چاروں طرف سے دیکھتے ہوں اور عش کر اٹھتے ہوں۔ البتہ ایک اس اینٹ نہ ہونے سے پوری عمارت نامکمل ہو، سوں لو! کہ یہ ضروری اینٹ جس نے اس رخنے کو بند کر دیا۔ میں ہوں۔ میری وجہ سے اب عمارت مکمل ہو گئی اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ ایک روایت میں اس طرح آیا ہے، کہ یہ اینٹ میں ہوں اور میں نبیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہوں۔“

آپ کی چھ خوبیوں میں سے ایک خوبی ختم نبوت بھی ہے
وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُضِّلَتْ
عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ باتوں میں بھی تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت بخشی گئی ہے۔

(۱) أَعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلْمَةِ

مجھے جامع کلمات سے بہرہ مند کیا گیا ہے،

وَنُصِّرْتُ بِالرُّغْبِ
و شمنوں پر میری دھاک بٹھائی گئی ہے۔

(۲) وَأَخْلَقْتُ لِي الْفَنَائِمَ

غناہم کو میرے لئے جائز تھرا گیا ہے۔

(۴) وَجَعَلْتُ لِي الْأَرْضَ مَسْجِدًا وَظَهُورًا

پوری زمین کو سجدہ گاہ اور پاک قرار دیا گیا ہے۔

(۵) وَأَرْسَلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَةً

میری رسالت کا دائرہ تمام انسانوں تک ممتد ہے۔۔

(۶) وَخَتَمْتُ بِيَ النَّبِيُّونَ

مجھ پر انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔

جھوٹے مدعاوں نبوت آئیں گے لانبی بعدی کی تصریح

عَنْ سَوْبَانَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ

سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي كَذَابُونَ ثَلَثُونَ كُلُّهُمْ يَرْعَمُ أَنَّهُ نَبِيُّ اللَّهِ وَآنَا خَاتَمُ

النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيٍّ (ابو داؤود، ترمذی)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا میری امت میں جھوٹے پیدا ہوں گے۔ سب یہ خیال کریں گے کہ وہ اللہ

کے نبی ہیں۔ حالانکہ مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں

ہوگا۔“

آنحضرت ﷺ عاقب بھی ہیں

إِنَّ لِي أَسْمَاءً آنَا مُحَمَّدٌ وَآنَا أَحَمَّدُ إِلَيْ قَوْلِهِ وَآنَا الْعَاقِبُ وَالْعَاقِبُ

الْذِي لَيْسَ بَعْدَهُ نَبِيٌّ۔ (بخاری و مسلم)

”میرے کئی نام ہیں۔ میں محمد ہوں، احمد ہوں اور میں عاقب بھی ہوں، عاقب وہ ہوتا ہے جس کے بعد اور کوئی نبی پیدا نہ ہو۔“

حضرت عمرؓ کی جلالت شان اگرچہ نبوت کی مقاضی ہے مگر ختم نبوت مانع ہے

لَوْكَانَ بَعْدِيُّ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرَ بْنُ الْخَطَّابِ (ترمذی)

”اگر میرے بعد کسی نبی کا پیدا ہونا مقدر ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ضرور نبی ہوتے“

امت محمد یہ ﷺ میں آئندہ سلسلہ خلفاء کا ہوگا

كَانَتْ بَنُو اسْرَائِيلَ تَسْوُ سَهْمَ الْأَنْبِيَاءِ كُلُّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَإِنَّهُ
لَا نَبِيٌّ وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيُكْثِرُونَ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

”بنی اسرائیل میں تو تدبیر و سیاست کی عنان انبیاء علیہم السلام کے باہم میں رہی جب ان میں ایک نبی فوت ہوا و سرے نبی نے اس کی جگہ گھیری۔ اب چونکہ میرے بعد نبی پیدا نہیں ہوں گے اس لئے خلفاء ہوں گے اور کثرت سے ہوں گے۔

حضرت ہارون علیہ السلام کے مقام پر فائز ہونے والا بھی اس لئے
نبی نہ ہو سکا کہ اب یہ منصب ہی نہیں رہا

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ أَنْتَ مَنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ
مِنْ مُوسَى الْأَكَانَةَ لَا نَبِيٌّ بَعْدِيٍّ

”امنحضرتؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا! تیرا معاملہ میرے ساتھ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہارون علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا، فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی

نہیں،

نبوت و رسالت دونوں کے کواڑ بند ہیں۔

إِنَّ الرَّسُالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدْ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُولَ بَعْدِي وَلَا نَبِيٌّ

(ترمذی، مسنڈ احمد)

”رسالت و نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا، پس اب میرے بعد نہ کوئی رسول پیدا ہو گا نہ نبی“

آنحضرت ﷺ کا ایک نام مقتضی بھی ہے

عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يُسَمِّي لَنَا نَفْسَهُ أَسْمَاءً فَقَالَ أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَحْمَدٌ وَالْمُقْفَىٰ (مسلم)

”ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے ہمیں اپنے نام گن گن کر بتائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں محمد ﷺ ہوں، میں احمد ﷺ ہوں اور مقتضی ﷺ یعنی آخری ہوں۔

اب رویائے صالحہ کے سوا

نبوت کے قبیل کی اور کوئی شے نہیں رہی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَرْفُوعًا أَنَّهُ لَيْسَ يَبْقَى بَعْدِي مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا

الرُّؤْيَا الصَّالِحةُ (نسائی)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نبوت کے قبیل سے میرے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہے گی سوار رویائے صالحہ کے کوہ رہے گا۔“

آخری نبی اور آخری امت

عَنْ أَبِي أُمَّامَةَ الْبَاهْلِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَخْرُ الْأَنْبِيَاءِ وَأَنْتُمْ أَخْرُ الْأَمَمِ (ابن ماجہ)

”حضرت ابو امامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ آپؓ نے فرمایا میں تو انبیاءؑ کے آخر میں آیا ہوں اور تم وہ ہو جو سب امتوں کے آخر میں ہو،“
ایک اور تصریح

عَنْ ضَحَّاكَ بْنِ نُوفَلٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا
نَبِيَّ بَعْدِي وَلَا أُمَّةً بَعْدَ أُمَّتِي (بیہقی)

”حضرت ضحاک بن نوبلؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا آخر حضرتؓ کا ارشاد
ہے۔ کہ میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا اور میری امت کے بعد کوئی (تی) امت
نہیں۔ و پائے گی۔“

ایک اور تصریح

إِنِّي أَخْرُ الْأَنْبِيَاءِ وَمَسْجِدِي أَخْرُ الْمَسَاجِدِ (المسلم)
میں تو انبیاءؑ کے آخر میں ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے۔ جو مسجد نبویؓ
کے نام سے پکاری جائے گی۔)

تمہیں صرف میری نبوت کے متعلق پوچھا جائے گا
يَا آيُهَا النَّاسُ إِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي وَلَا أُمَّةً بَعْدَ كُمْ وَأَنْتُمْ تَسْأَلُونَ

(مسند احمد)

اے لوگو! میرے بعد اور کوئی نبی پیدا ہونے کا اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں تمہیں

عَنِّي

میری بابت ہی پوچھا جائے گا۔“

قیامت اور میرے درمیان کوئی نبوت حاصل نہیں

عَنْ أُنْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْثَتْ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتِينَ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں اور قیامت یوں اتصال رکھتے ہیں جس طرح یہ دو انگلیاں (یعنی نجح کی اور شہادت کی انگلی)۔

لوگو! جس طرح تمہارا باپ ایک ہے

اسی طرح تمہارا پیغمبر بھی ایک ہے۔

يَا أَيَّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحْدُوا أَبَابَكُمْ وَاحْدُوا نَبِيًّا وَاحْدُ لَا تَبْدِيلَ (کنز العمال)

بعدی اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے۔ تمہارا دین بھی ایک ہے۔ اور پیغمبر بھی ایک کیونکہ میرے بعد اور کوئی نبی نہیں۔“

صرف آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا ہے

لَوْكَانَ مُؤْسَى حَيَا مَأْوَسَعَةً إِلَّا اتَّبَاعِي (احمد، بیہقی)

”اگر موسیٰ اللہ عزیز زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری پیروی کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا،“

ختم نبوت کا منصب پہلے سے تھا

عَنِ الْغَرَبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَنَّهُ قَالَ إِنِّي عِنْدَ اللَّهِ مَكْتُوبٌ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ آدَمَ لِمَجَنِّدٍ فِي طِينَةٍ
(مشکوہ)

حضرت عرباض بن ساریہ رض سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میرا خاتم النبین ہونا تو اس وقت سے طے ہے۔ جب آدم صلی اللہ علیہ وسَلَّمَ کی مٹی ابھی گوندھی جا رہی تھی،

پہلے نبی آدم صلی اللہ علیہ وسَلَّمَ اور آخری نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسَلَّمَ
عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَبَا
ذَرٍّ أَوَّلَ الْأَنْبِيَاءُ آدَمُ وَآخِرُهُمْ مُحَمَّدٌ (صحیح ابن حبان)
”ابوزر رض سے مروی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا اے ابوذر سب سے پہلے نبی تو
آدم صلی اللہ علیہ وسَلَّمَ میں اور آخری محمد صلی اللہ علیہ وسَلَّمَ۔

ان دلائل کی وضاحت میں

آیات و احادیث کی یہ فہرست آپ کے سامنے ہے اس میں دیکھنے اور
دکھانے کی یہ چیز ہے کہ ایک ہی حقیقت کو قرآن و سنت میں کس کس ڈھنگ سے بیان
کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ کی ہر ہر آیت اور حدیث اس لائق ہے کہ تنہ اس کو مسئلہ زیر بحث
کے لئے استدال و استنباط کا مبنی قرار دیا جائے۔ تاہم اس کفایت و وضاحت کے
باوجود ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ دلائل و شواہد کی پوری بولگوئی پر نظر ڈالئے۔ تاکہ کوئی گوشہ
نظر سے اوچھل نہ ہونے پائے پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ ذوق و فہم کی کبھی تاویل و تحریف
کے کن کن سورچوں میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔

نگاہ کی چشم کی زلف دو تاکہ
سہے دل جفا کس کس بلا کی

یوں تو جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایک ایک آیت و حدیث میں ختم نبوت کی ایسی تعبیر پڑی چھلک رہی ہے کہ شبہ کیلئے کوئی موقع ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ان سب کو ایک ساتھ جوڑنے اور ملانے میں جو لطف ہے وہ تنہا ایک ایک میں کہاں ہم اس پورے مجموعے کو قائم رکھتے ہوئے ان دلائل کے متعلق صرف اس حد تک مختصرًا تعریض چاہتے ہیں۔ جس حد تک بعض پہلوؤں کو جاگر کرنے اور نظر کے سامنے لانے کا تعلق ہے۔ تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کتاب و سنت میں ان تمام شکوک و شبہات کو کیونکر پہلے سے مرعی رکھا گیا ہے۔ جو کسی وقت دل میں پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر کتنی خوبی سے ان کا سد باب کیا گیا ہے۔

پہلے سورہ احزاب کی اس آیت کو لیجئے جس میں آنحضرت کو ”خاتم النبین“ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اور بغیر کسی خارجی شہادت کے اس کی داخلیت پر غور فرمائیے یہاں جس بات کی تردید کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جو جناب زید رضی اللہ عنہ کا باپ کہا جاتا ہے وہ غلط ہے، وہ تو صرف آپ ﷺ کے لے پالک تھے۔ اور لے پالک کسی شکل میں بھی حقیقی بیٹھ جیسا نہیں ہوتا اس کی تردید کیلئے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ زید تو زید آنحضرت ﷺ تم میں سے کسی مرد کے بھی حقیقی باپ نہیں ہیں۔ نہ کہی پھر اور کیا شہہ ہے؟ ان کے اور ان کی افراد کے ارمیاں؟ تو فرمایا اللہ تعالیٰ
لہ تعالیٰ ہیں یعنی روحانی باپ ہیں۔ اس معنی کو کہ نبی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے دوسری جگہ اس طرح فرمایا ہے:-

وَأَزْوَاجُهُ أَمْهَاتُهُمْ (الاحزاب: ۶)

اور اس کی بیویاں تمہاری مائیں ہیں،“

جب پیغمبر ام کے روحاں باپ بھرے تو اس رشتہ کی وضاحت تو ہو گئی جس کا جانا مقصود تھا اب خاتم النبیین کہہ کر اسی رشتہ کی ملکی اور استواری کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ پھر یہ باپ بھی ایسا معمولی باپ نہیں جس کی شفقتوں سے تم کسی وقت محروم ہو جاؤ۔ نہیں یہ اس ذہب کا باپ ہے کہ قیامت تک کیلئے اس کی پدرانہ شفقتیں زندہ رہیں گی، اب اس کے بعد اور کوئی ایسا سرپرست نہیں پیدا ہونے کا جو تمہارا باپ کہا لے کیونکہ یہ آخری نبی ہے۔

سورہ سبا کی آیت میں فرمایا ”تم کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا ہے۔ یعنی اگر قیامت تک کی کائناتِ انسانی کو ایک عصر میں جمع کیا جاسکے تو وہ آنحضرت ﷺ کا عصرِ نبوت ہو گا کافہ لفظ ان سب لوگوں پر بولا گیا۔ جو کسی وقت بھی آپ اکی دعوت کے مخاطب ہو سکتے ہیں۔ آنحضرت اکی دعوت کا یہ پھیلاوا اس لئے ہے کہ دین کے سارے تقاضے ہی مکمل ہو چکے۔ اب کوئی حالتِ منتظرہ نہیں رہی جس کے لئے کوئی نیا نبی پیدا ہو۔ اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت جس کا تذکرہ سورہ مائدہ میں ہوا ہے یہی مطلب ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو دوسری جگہ سورہ فرقان میں للعلمین نذیر آکہہ کر پکارا۔ یعنی آپ ﷺ کی تبلیغ و اشاعت کا دائرہ تمام ”عوالم“ تک متد ہے۔ اور عالم کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں دنیا نے انسانیت کی پوری وسعت سمائی ہے۔ ان آیات کو ان احادیث کے ساتھ ملا یئے۔ جن میں ختم نبوت پر مختلف طریق سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلی ہی حدیث کا صحیحین کی ملاحظہ ہو کہ اپنے مفہوم میں کس درجہ تغیین اور واضح ہے۔ یعنی نبوت کو ایک قصرِ تصور کرنا اور پھر آنحضرت ﷺ کا اپنے کو اس قصر کی آخری

اور تکمیلی اینٹ قرار دینا کتنی عمدہ تشبیہ ہے۔ اس میں غور طلب حقیقت یہ ہے کہ ”خُتَمَ بِيَ النَّبِيِّينَ وَ خُتَمَ بِيَ الرَّسُولِ“ فرمایکر آنحضرت ﷺ نے لفظ ختم کے موردو معنی کو بالکل واضح فرمادیا ہے۔ یعنی خاتم النبیین میں جو جمل و نادانی سے ایک بالکل نئے معنی پیدا کئے جاتے تھے ان کا بخوبی انسداد ہو گیا۔

دوسری حدیث سے جو مسلم میں ہے۔ لفظ کافۃ کی تشریع ہو گئی کہ ختم نبوت کے متراود ہے۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ وَأَرْسَلَتِ إِلَى الْخَلْقِ كَافَةً وَخُتَمَ بِيَ النَّبِيِّونَ ”مجھے تمام دنیا کی طرف رسولؐ بننا کر بھیجا گیا اور مجھ پر انیاء (علیہم السلام) کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔“

ترمذی کی اس حدیث سے کہ ”اگر میرے بعد کسی نبی کا پیدا ہونا مقدر ہوتا تو عمر“ ہوتے، اس شبہ کا ازالہ ہو گیا کہ نبوت مخصوص ایک فضیلت ہے۔ جو کثرت اطاعت یا آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک مخصوص لگاؤ کی وجہ سے عطا ہوتی ہے۔

بخاری و مسلم کی اس حدیث سے کہ گَانَبَتْ بَنُو اسْرَائِيلَ تَسْوُسَمُ الْأَنْبِيَاءُ ”بنی اسرائیل میں عنان تربیت انیاء علیہم السلام کے ہاتھوں میں رہی،“ اور اب خلفاء ہوں گے کیونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد دین کی خدمت اور امت کی اصلاح کا انداز کیا ہوگا۔

اسی طرح ان تمام احادیث پر نظر ڈالتے جائیے جس میں ”لَا نَبِيَ بَعْدِي“ کی تکرار ہے۔ اور یہ ملاحظہ فرمائیے کہ اس مفہوم کو الفاظ کی اٹ پھیر کے ساتھ کتنے اسالیب میں سمو یا ہے؟ اس لئے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ اس مسئلہ کی وضاحت اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں، یوں تاویل کے حدود ملکات کا یہ حال ہے کہ نصوص صریح کو مشابہات کے تحت میں رکھا جا سکتا ہے اور مشابہات کو اصل کتاب اور امام الکتاب

ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ہمیں اس موقع پر صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے جو ذہب کتاب و سنت میں اختیار کیا گیا ہے، کیا انسانی قدرت میں اس سے زیادہ کی استطاعت ہے؟ اور کیا کوئی خلش ایسی ہے جو قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے یا کوئی شبہ ہے جو دل میں ٹھہر سکتا ہے؟ قرآن و حدیث کے ان تمام دلائل کو میں ایک ہی دلیل قرار دیتا ہوں اور میرا مطالبه یہ ہے کہ ان پر جب بھی نظر ڈالی جائے تو وہ مجموعی حیثیت سے ہوا یک ایک آیت اور ایک ایک حدیث پر سرجوی نہ فرمائی جائے۔ اس اندازِ فکر سے ہم لغت کے تائیدی حوالوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں تاہم بات تشنہ رہے گی اگر یہ نہ بتایا گیا کہ آئندہ لغت کی اکثریت نے جن کی رائے ہم تک پہنچ سکی ہے افظ ”ختم“ سے کیا سمجھا ہے۔

ایک حقیقت کا دانستہ اعتراف

یہ واضح رہے کہ ہمارا نقطہ نظر یہاں بھی لغت کی ورق گردانی یا حوالہ بازی نہیں بلکہ ہم اس کو بالکل دوسرے ذہب سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جاننے اور اس پر بحث کرنے میں بڑا لطف ہے! بسا اوقات آدمی بات وہی کہہ دیتا ہے جس سے اس کے خصم کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن نادانی و جبل کی وجہ سے یہ نہیں جان پاتا کہ کیونکر؟ آپ نے یہ اکثر دیکھا ہوگا کہ دوران بحث لفظ ”ختم“ کیوضاحت کرتے ہوئے جب متعدد حوالے پیش کئے گئے اور یہ بتایا گیا کہ یہ سب حضرات اس کی ایک ہی تعبیر پر متفق ہیں تو مخالف کہپ سے اس کا ذہلا ذہلا یا جواب یہ ملا (اور ان کے ہاں جواب اکثر تیار رہتے ہیں) کہ اس تعبیر پر اتفاق رائے ان کے ہم عقیدہ ہونے کی وجہ سے

ہے ورنہ اس کے تحقیقی معنی وہی ہیں جو ہمارے حضرت پر منکشف ہوئے۔ سبحان اللہ! آپ نے غور فرمایا کہ کتنی بڑی بات بے اختیار ان کے منہ سے نکل گئی اور ایسے ڈھنگ سے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ بس اسی میں لطف ہے۔

لغت کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل اور اس معمد کی حیثیت معلوم کرنے کیلئے اس پر غور کرنا ہوگا کہ خود یہ لغت کیا ہے؟ کیا اس کی حیثیت صرف یہ ہے کہ اس میں ہزاروں الفاظ کے معانی سے بحث کی جاتی ہے اور بس (ابو بکر زبیدی کی رائے میں صرف کتاب العین میں جن الفاظ کی وضاحت ہے ان میں وہ الفاظ جن کا استعمال ہوتا ہے۔ 5620 ہیں) یا اس کی حیثیت اس سے کچھ زیادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا خلیل، قطرب، ابن مالک، جمال الدین بن مکرم، ابن ہشام، جوہری اور فیروز آبادی نے صرف الفاظ کی چہرہ کشائی فرمائی ہے یا ان کی کوششوں سے بالواسطہ کچھ ہائق بھی منظر عام پر آئے ہیں۔

فنِ تفسیر کا اعجاز

کہنے کو قرآن حکیم کی تفسیر کے معنی یہ ہیں کہ اس میں مختلف دور کے علماء نے اپنے اپنے فہم اور انداز سے قرآن حکیم کو جو سمجھنے کی کوشش فرمائی ہے اس کی وضاحت ہے۔ اور تحقیق سے دیکھئے گا تو اس کے ساتھ ساتھ مجلدات تفسیر میں ایک اور شے بھی آپ کو ملے گی اور وہ یہ ہے کہ ان مفسرین کے زمانے میں کن علوم کا چرچا تھا کیا کیا مسائل زیر بحث تھے اور زیادہ تر دلائل کا کن نکات پر زور رہتا تھا۔ گویا عقلی تحریک کی ایک پوری تاریخ صرف ایک اس فنِ تفسیر سے ہی مرتب کی جاسکتی ہے۔ یعنی فنِ تفسیر

صرف فین تفسیر ہی نہیں بلکہ اسلامی ذہن کی ایک عقلی تاریخ بھی ہے۔

لغت ایک تاریخ

اسی طرح جن لوگوں کی نظر اس حقیقت پر ہے کہ لغت ہر ہر دور کے اطلاعات سے بحث کرتی ہے اور ہر ہر دور کی اصطلاحات و تاویلات کی گریزی کھوٹی ہے انہیں اس حقیقت کو پالینے میں کوئی دشواری نہیں محسوس ہوگی کہ اس کی ایک حیثیت تاریخ کی بھی ہے۔ یہ جہاں یہ بتاتی ہے کہ ایک لفظ کا شجرہ نسب کیا ہے۔ اس کے کیا کیا استعمالات و مشتقات ہیں وہاں یہ بھی بتاتی ہے کہ زمانے کے مختلف ادوار میں کن کن نئی اصطلاحات کا اضافہ ہوا اور کن کن الفاظ کے معنی میں کیا کیا تغیری رونما ہوا۔ چنانچہ اہل لغت میں ایک گروہ مستقل طور پر وہ ہے جس نے خصوصیت سے انہی تغیرات سے بحث کی ہے جیسے جرجانی کہ انہوں نے ”التعريفات“ اسی غرض سے لکھی یا تھانوی جنہوں نے کشف اصطلاحات ”الفون“، جیسی ضمیم کتاب رقم فرمائی جو قریب قریب دو ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ”کلیات الی القا“ کو بھی اسی ذہب کی شے سمجھئے، گویا لغت بھی ایک طرح کی تاریخ ہے۔ جس طرح تاریخ میں سلاطین و ملوك اور ان کے کارناموں سے بحث ہوتی ہے اسی طرح اس میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کن کن لفظوں کا سنکر کس اقليم معنی میں چلا گیا اور پھر کب وہ متروک ہو گیا۔

اگر لغت کی یہ تعبیر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر ایک لفظ کی تعیین و اطلاق میں فیروز آبادی تک کے لغت نگار متفق ہیں۔ تو گویا نویں صدی کی ابتداء تک یہ ماننا پڑے گا کہ: اس کے اور کوئی معنی ذہنوں میں نہ تھے ورنہ ہر ہر دور میں ذخیرہ الفاظ میں، مجازات و اصطلاحات کا جواضافہ ہوتا رہا ہے اس کا پورا پورا

ریکارڈ کتب لغت میں موجود ہے۔

فقیہ اور مؤرخ میں فرق

یہی بات کہ اہل لغت جب کسی بات پر متفق ہوتے ہیں تو کیا ان کا یہ اتفاق اس نوعیت کا ہوتا ہے جس طرح فقہاء کا ایک مسئلہ پر کہ اس میں عصیت دلائل کا الزام ان پر دھرا جائے، یا وہ اس نوعیت کا ہوتا ہے، جیسے مؤرخین کا، یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کا جواب لغت کی اس تعبیر میں مل جاتا ہے۔ جو ہم نے بیان کی ہے مؤرخین جب متفق ہوتے ہیں تو ان کے اتفاق کا سبب ایک واقعہ ہوتا ہے جس میں تاویل کی کوئی لپک نہیں ہوتی اور ایک فقیہہ جب متفق ہوتا ہے تو اس کا موجب دلیل ہوتی ہے جس کے فہم میں دورائے ہو سکتی ہیں۔ لہذا اہل لغت کا اتفاق اس حقیقت کا ہم معنی نہ ہر اک تاریخی طور پر اس لفظ کے اطلاق میں گروہ علماء کے درمیان کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔

جستہ جستہ حوالے

اس وضاحت کے بعد کہ لغت نگار، صرف لغت نگار ہی نہیں ہوتے مؤرخ بھی ہوتے ہیں جستہ جستہ حوالوں پر غور فرمائیے:

از ہری، ہروی، المتنی 370ھ کا لغت نویسوں میں جو مقام ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ الفاظ کی چھان بین کی شوق بے پایاں نے انہیں گھر سے نکالا، تو ایک بدوسی قبیلہ نے خوبی قسست یا شومی قسست سے انہیں پکڑ لیا۔ برسوں انہی کی قید میں رہے اس سے ان کو موقعہ ملا کہ بغیر آمیزش کے بادی یہ عرب کی اصلی و حقيقة زبان تک ان کی رسائی ہو۔ انہوں نے ان خانہ بدوسوں کو روزانہ دیکھا ان سے با تمیں کیس۔ ان

کے محاورات اور عادات پر غور کیا اور اس کے بعد ”الہدیب“، لکھی اس میں ختم کے متعلق ان کی تصریحات یہ ہیں۔

وَالْخَاتَمُ وَالْخَاتُمُ مِنْ أَسْمَاءِ النَّبِيِّ صَلَى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي
الْتَّنْزِيلِ الْعَزِيزِ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلِكُنْ رَسُولَ
اللَّهِ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ، إِنَّ أَخَرَهُمْ.

خاتم (بالکسر) اور خاتم (بالفتح) آنحضرت ﷺ کے اسماء گرامی ہیں اور قرآن میں بھی مذکور ہے۔ کہ ”محمد ﷺ“ تم میں کسی کے باپ نہیں لیکن رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، یعنی سب سے آخر میں آنے والے ہیں۔“

جو ہری الم توفی 398ھ لغت و ادب کے بہت بڑے امام ہیں۔ انہوں نے بھی تحصیل زبان میں صرف کتابوں پر تکمیل نہیں کیا بلکہ خود گھوم پھر کر زبان کے ایک ایک مرکز تک پہنچ۔ انہوں نے فطرت کے ان بیٹوں سے بھی استفادہ کیا جو کھلے آسمان کے نیچے زندگی بر کرتے تھے اور ان آسمان کی صحبت میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا جو بڑے بڑے شہروں میں علم و فن کا درس دیتے تھے۔ یہ اپنی کتاب ”الصحاب“ میں رقم طراز ہیں:-

خاتمه الشی آخرہ و محمد صلی الله علیہ وسلم خاتمه الانبیاء

”کسی چیز کے خاتم کے معنی آخر کے ہوتے ہیں، انہی معنوں میں آنحضرت ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔“

ابن سیدۃ الم توفی 458ھ ان کی کتاب الحکم گویا لغت و ادب کا سمندر ہے۔ ان کے والد ماجد بھی بہت بڑے لغت دان تھے ان کی بلند پائیگی کیلئے یہ جان لینا کافی

— مرااثیت نے زاویوں سے
ہے کہ صاحبِ قاموس نے اکثر انہی کے معارف سے اپنی بزم علم سجائی ہے یہ فرماتے
ہیں:-

”وَخَاتَمُ كُلِّ شَيْءٍ وَخَاتَمَ عِاقَبَتَهُ وَآخِرَهُ“
”اور خاتم یا خاتمه کے معنی انجام و آخر کے ہیں“

جمال الدین بن مکرم التوفی 711ھ میں متاخرین میں سب سے بڑے
امام ہیں۔ ان کی کتاب ”سان“ کو جو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، یہ واقعہ ہے کہ کسی کو
نہیں ہوئی، یہ ادب، تاریخ اور تفسیر کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اس کی مثال نہیں ملے گی، یہ
فرماتے ہیں:-

خاتمهم او خاتمهم اخرهم ”خاتم اور خاتم دونوں کے معنی آخر کے ہیں“
ابو بکر محمد بن عزیز التوفی 382ھ نے قرآن حکیم کے الفاظ کی شرح لکھی ہے
جس میں کوئی پیچیدگی یا ندرت نہیں ہے۔ وہ اپنی کتاب ”نزہۃ القلوب“ میں
لکھتے ہیں۔

خاتم النبیین اخر النبیین ”خاتم النبیین سے مراد آخر النبیین کے
ہیں“

الراغب الاصفہانی التوفی 502ھ بہت بڑے عالم ہیں ان کی کتاب ”
الزدیعہ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار ”علم الاخلاق“ کے اساتذہ میں ہونا
چاہئے تھا لیکن انہوں نے چونکہ قرآن حکیم کی تفسیر اور اس کی لغت پر بھی خصوصیت
سے قلم اٹھایا ہے۔ اس لئے ان کی شہرت لغت نگاری کی حیثیت سے ہوئی۔ ان
کا کہنا ہے:-

”وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ لَا نَهْخَتَمُ النَّبُوتَ أَىٰ تَمَمَّهَا بِمَجِيئِهِ“

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبین اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ آپ ﷺ نے نبوت کو مکال و تمام تک پہنچا دیا۔“

الفیر و ز آبادی المتنی 817ھ تیمور لنگ اور بایزید عثمانی کے معاصر ہیں ان کی کتاب ”القاموس“، ”السان“ کے بعد دوسری کتاب ہے۔ جس کو قبول عام کی سند ملی ہے۔ یہ فرماتے ہیں:

”والخاتم اخر القوم كالخاتم و منه قوله تعالى و خاتم النبین“
 ”خاتم“ کے معنی آخر قوم کے ہیں جیسے مہر، خط کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔
 خاتم النبین کے بھی یہی معنی ہیں۔“

اس حوالے میں غور طلب حقیقت یہ ہے کہ ”مہر کو جن معنوں میں خاتم سمجھا جاتا ہے۔ وہ ہرگز نہیں ہے۔ جس کو مراہنیت کی ایجنسی نے پیدا کیا ہے۔ کہ ایسی نبوت آفریں کہ جس سے چھواجائے وہ نبی ہو جائے۔“

سید مرتضی الزبیدی المتنی 1205ھ میں ”قاموس“ کے مشہور شارح ہیں لین نے اپنی ڈکشنری میں زیادہ تر استفادہ انہیں سے کیا ہے۔ ان کی تصریحات ملاحظہ ہوں:-

ومن اسمائہ علیه السلام الخاتم والخاتم وهو الذين ختم النبوة بجيئه ”اور آپ ﷺ کے ناموں میں خاتم و خاتم بھی ہے۔ اور وہ وہ ہے جس نے اپنی آمد سے نبوت کے آئندہ امکانات کو روک دیا“

ابوالبقاء الحسین المتنی 1094ھ انہوں نے مصطلحات عربیہ پر ایک مستند کتاب لکھی ہے۔ جو ”کلیات البقاء“ کے نام سے مشہور ہے اس میں یہ صراحة سے مذکور ہے کہ

والخاتم اخر القوم کا الخاتم و منه قوله تعالى و خاتم النبیین " خاتم کے معنی آخر قوم کے ہیں جیسے مہر، خط کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ خاتم النبیین کے بھی یہی معنی ہیں۔

بحث کو ختم کرنے سے پہلے فرزوق کے اس مشہور قصیدے میں سے ایک شعر جو اس نے ہشام بن عبد الملک کے سامنے حضرت حسینؑ کے جلیل القدر بیٹھے زین العابدینؑ کی تعریف میں پڑھا۔ ہم پیش کرنا چاہتے ہیں جو اس بات میں بیت القصیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قصہ دلچسپ ہے سن لیجئے۔

ہشام شام کے امراء کے لاڈنگر کے ساتھ اپنے بھائی ولید کی خلافت میں حج کو روانہ ہوا جب مکہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص بہت پاکیزہ نہایت بزرگ، نہایت خوبصورت اور وجیہ مناسک حج کی ادائیگی میں مصروف ہے اور لوگوں کے جلال و احترام کا یہ حال ہے کہ وہ جدھر کارخ کرتا ہے دور ویہ کھڑے ہو جاتے ہیں ہشام کے ساتھیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ فرزوق آگے بڑھا اور یہ قصیدہ بطور تعارف پیش کیا۔

هذا ابن فاطمه ان کنت جاہله
بجده انبیاء اللہ قد ختموا
”یہ وہ شخص ہے بطلعاء کی زمین جس سے آگاہ ہے، اسے بیت اور حرم وغیرہ
کے لوگ بخوبی جانتے ہیں“

هذا ابن فاطمه ان کنت جاہله بجده انبیاء اللہ قد ختموا
”اگر تمہیں علم نہ ہو تو جان لو کہ یہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نونہال ہے۔ یہ وہ ہے
جس کے نام پر انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ختم ہوا۔“

جریانِ نبوت کے دلائل کی نوعیت

گزشہ صفات میں ہم نے جس انداز اور نجح سے ختم نبوت کے دلائل پر غور کیا ہے اسی ذہب سے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جریانِ نبوت کے دلائل کی قدر و قیمت کیا ہے جس طرح ختم نبوت سے متعلق تمام آیات و احادیث پر ہم نے مجموعی نظر ڈالی ہے ٹھیک اسی طرح ہماری یہ خواہش ہے کہ ان تمام دلائل کو بھی ایک جا اور ایک ساتھ اکٹھا دیکھا جائے، جو جریانِ نبوت سے متعلق ہیں اور پھر یہ بتایا جائے کہ ان سے جو تاثرات ذہن بغیر مناظرانہ کرید اور اپنے کے از خود حاصل کرتا ہے وہ کیا ہیں، آیا ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی نبوت و رسالت کا چشمہ فیض جاری ہے؟ اور نبوت و رسالت کے کچھ اور بھی محل ہیں جن کی تعمیر ہونے والی ہے؟ یا یہ کہ ان دلائل سے قطعی کسی نبوت جدیدہ یا رسالتِ مستائفہ کا سراغ نہیں ملتا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان آیات میں جنہیں ختم نبوت کے جواب میں پیش کیا جاتا ہے ان میں فیوضِ رشد و ہدایت کا تذکرہ ہے جن کا آغاز حضرت آدم ﷺ سے ہوا اور آنحضرت ﷺ کی ذات ستودہ صفات پر ان کی تکمیل ہو گئی۔ یا کچھ نئے انوار و تجلیات کی خبر ہے۔ جن سے بنی آدم کی آنکھیں روشن ہونے والی ہیں۔ یعنی تحقیق طلبِ نکتہ یہ ہے کہ ان آیات کو جن میں کسی ہدایت کے آنے کی حکایت ہے اس ہدایت پر محمول کیا جائے گا جو آچکی۔ **قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيْ (البقرة)** یا کسی نئی ہدایت پر چسپاں کیا جائے گا؟ جواب تک منظر عام پر نہیں آئی۔

کچھ اور ضروری بحثیں بھی ہیں جو اسی سلسلے سے متعلق ہیں، انشاء اللہ وہ خاص ترتیب کے ساتھ آگے آئیں گی۔ سر دست ہمیں کچھ ایسے اعتراضوں کا سامنا

ہے۔ جن کے ذوقِ ادب کی محرومیوں اور مطالعہ کی کمی نے پیدا کیا ہے، پہلے ان کے جواب پر غور فرمائجئے پھر آگے بڑھیں گے۔

کیا خاتم کے معنیِ افضل کے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ خاتم و آخر کے معنیِ افضل و بہتر کے ہیں، چنانچہ ہم برابر اس طرح کی ترکیبیں سنتے اور استعمال کرتے ہیں کہ فلاں خاتم الشعراً ہے، فلاں خاتم المحمدیں ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ امام ابن تیمیہؓ کے حق میں فرمایا ہے کہ یہ آخر المجتهدین ہیں۔ ان سب استعمالات میں کہیں یہ مقصود نہیں ہوتا کہ اب شعر و خن کی صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں یا اب کوئی محدث پیدا نہیں ہو گا یا یہ کہ ابن تیمیہؓ پر اجتہاد و اتنیباط کے تقاضے اس طرح مکمل ہو گئے ہیں کہ ان کے بعد کوئی اجتہاد کا عویٰ نہیں کر سکے گا۔

جواب کی دو صورتیں

بات زیادہ الجھاؤ کی نہیں، جواب کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ بااعتبار زاعم کے ہے یعنی جب ایک شخص کسی کو خاتم الشعراً کہتا ہے تو وہ واقعی یہ سمجھتا ہے کہ اس کے بعد شعر کہنا بے کار ہے ورنہ مدحت میں غلو ج مقصود اور مبالغہ کی جان ہے بے معنی ہو کرہ جاتا ہے۔ اسی طرح خاتم المحمدیں اور آخر المجتهدین کے الفاظ استعمال کرنے والا یہی سمجھتا ہے کہ محدثیت و اجتہاد کی یہ آخر کڑیاں ہیں ورنہ یہ ترتیب پھپھی اور بے مزہ ہو گی۔ کیونکہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان الفاظ کے استعمال سے ایک گونہ فضیلت ثابت کرنا ہی مقصود ہے تو ان میں زور کیا خاک باقی رہے گا۔

اب یہ کہنے والا یا زعم نہ تو پیغمبر ہے اور نہ یہ کوئی پیشیں گوئی ہی ہے بلکہ مدح کا ایک انداز ہے، جو اختیار کیا گیا ہے۔ اس لئے اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص شعر و سخن کے ذوق سے بہر مند ہو جاتا ہے یا محدثیت و اجتہاد کی مند پر بیٹھ جاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرا انداز یہ ہے کہ مجاز و حقیقت کے استعمال میں فرق ہے، جب کوئی لفظ اپنے موضوع لے، معنوں میں استعمال ہو گا تو وہ حقیقی ہو گا۔ اور جب کسی مناسبت سے ہوان معنوں میں استعمال نہ ہو سکے گا تو یہ مجاز ہو گا۔ مثلاً شیر کا ایک استعمال یہ ہے کہ وہ ایک درندے کا نام ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ اس کے معنے بہادر شجاع کے ہیں۔ پہلا استعمال حقیقی ہے۔ اور دوسرا مجازی ہے۔

ایک جاننے کی بات

یہاں یہ بات جاننے کی ہے کہ کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتے وقت مجازی معنوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے بخلاف مجاز کے کہ اس میں تنہا مجازی معنی ہی پائے جاتے ہیں۔ جیسے شیر کہ یہ جہاں ایک درندہ ہے بہادر اور شجاع بھی ہے لیکن جب اس کا اطلاق کسی انسان پر ہو گا تو اس کے معنی صرف بہادر کے ہوں گے، حقیقی شیر کے نہیں، اس خیال سے خاتم النبیین کے معنے اگر حقیقی لئے جائیں تو اس میں یہ خوبی ہو گی کہ فضیلت کے معنے از خود اس میں آجائیں گے بخلاف مجاز کے، کہ اس میں ختم نبوت کی وہ تعبیر نہ آ سکے گی جس کی تائید قرآن و حدیث اور لغت و ادب کے حوالوں سے ہوتی ہے۔ پھر مجازی معنے وہاں مراد ہوتے ہیں جہاں حقیقت متعذر ہو جہاں یہ حال ہو کہ حقیقت کی تائید میں قرآن ہی نہیں، شواہد و دلائل کا ایک انبار ہو جیسا کہ آپ دیکھے چکے، وہاں مجازی معنوں کیلئے کوئی وجہ جواز ہی پیدا نہیں

ہوتی۔

حضرت عائشہؓ کا قول

درمنثور کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کا ایک قول پیش کیا جاتا ہے کہ قولوا خاتم النبیین ولا تقولوا لانبی بعدہ ”تم خاتم النبیین تو کہو! لیکن یہ نہ کہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا“ اس کا دوڑوک جواب تو یہ ہے کہ یہ قول ہی مردود ہے۔ اس کی کوئی سند مذکور نہیں پہلے تو یہ ثابت کیجئے کہ کتب حدیث میں یہ کہیں مذکور ہے اور اس کی کوئی محدثانہ قدر و قیمت ہے پھر گفتگو آگے بڑھے گی۔

دوسرा جواب یہ ہے کہ کیوں نہ اس کا صحیح محل تلاش کیا جائے۔ جب ختم نبوت اور لانبی بعدی، ایک مضبوط سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ جس کا متعدد پیرایہ ہائے بیان سے اثبات ہو چکا ہے۔ تو اس کے معنی قطعی ان کے منافی نہیں ہو سکتے۔ بات واضح ہے۔ حضرت عائشہؓ چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ ﷺ تشریف لانے والے ہیں اس لئے وہ احادیث کے اطلاق میں اتنی سی گنجائش چاہتی ہیں۔ کہ ان کی آمد پر کوئی اثر نہ پڑے اور اس کا ثبوت یہ حدیث ہے۔ جوان سے مرفوع عامروی ہے:-

عَنْ عَائِشَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لَا يَبْقَى بَعْدَهُ مِنَ النَّبُوَةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا الْمُبَشِّرَاتِ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَى الْمُسْلِمُ أَوْ يُرَى لَهُ (مسند احمد)

”حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کے

بعد بجز مبشرات کے ثبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یہ مبشرات کیا ہیں فرمایا صاحع خواب جو مسلمان خود دیکھے یا کوئی اس سے متعلق دوسرا مسلمان دیکھے۔“

جحت صرف کتاب اللہ اور سنت

حضرات صوفیاء کے بعض اقوال بھی اس سلسلہ میں پیش کئے جاتے ہیں۔
جن سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نبوت کی سلسلہ میں اب بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں۔ جو ریاضت و ترکیہ نفس کی مشقتوں کو جھیل جھیل کر اپنے دل آئینہ کو اتنا چمکالیں کہ ان پر فیوض نبوت کا پرتو پڑ سکے۔ اور جو اپنی صلاحیتوں کو اس درجہ سنوار لیں کہ مقام نبوت کے تمام انوار و تجلیات ان کو حاصل ہو جائیں۔

اس سے پہلے کہ ان اقوال کا صحیح صحیح محل ڈھونڈا جائے اور ان کے معانی کی تھیک تھیک تعین کی جائے۔ یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ جہاں تک جیت و استدلال کے دائروں کا تعلق ہے وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے آگے نہیں بڑھتے۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے مکلف تو ہیں جو قرآن و حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اس کو مانیں، اس کی وضاحت کریں اور اس پر جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب دیں۔ لیکن ہمارے لئے یہ سخت دشوار ہے کہ امت میں ہر شخص کے اعتقادات کو حق بجانب ثابت کریں بالخصوص جب سوال بنیادی عقیدوں کا ہو تو اس کیلئے تو لازماً ہمیں فکر و نظر کی عنان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہی موزنا چاہئے اور اس سے بالکل بے پرواہ ہو جانا چاہئے کہ کون کون کیا کیا کہتا ہے کیونکہ دین صرف اللہ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کے عمل و اسوہ سے تعبیر ہے۔ اس

کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ بشرط صحبت لا لئے صد احترام ہے اور بصورت اختلاف و عدم صحبت، بعض اقوال الرجال۔

نظر کی بھی

ہماری نظر میں یہ ٹیڑھ ہے کہ جو عقائد ہمیں کتاب اللہ میں تلاش کرنے چاہئیں اور جن تصورات کی پر چوں ہمیں چمنستانِ نبوت میں کرنا چاہئے ان کو ہم ان لوگوں کی کتابوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں جو ہر وقت غلطی کر سکتے ہیں، جن کا اپنے استقلال ہر جگہ پھسل سکتا ہے اور جن کی عصمت کی اللہ اور اس کے رسول نے کبھی حامی نہیں بھری۔

نبوت کا مسئلہ ایسا نہیں جسے امام عبد الوہاب شعرانی یا ابن العربي کے پردازیا جاسکے یہ اصولاً نصوص چاہتا ہے۔ کتاب اللہ اور حدیث کی واضح شہادات چاہتا ہے۔ یعنی اس مسئلہ کا مزاج اصولی اور بنیادی ہے۔ یہ استدلال و استنباط کی چیز نہیں بلکہ ایسا عقیدہ اور تصور ہے جس کی تائید قرآن حکیم کی کھلی کھلی اور ناقابلٰ تاویل آیات سے ہونی چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ اس عقیدہ کی اہمیت کا یہ تقاضا ہے کہ یہ عصر صحابہؓ میں مشہور ہوا اور صحابہؓ اور ان کے بعد تابعین رحمہم اللہ اور بڑے بڑے آئندہ اس کی حقانیت سے اتنا ہی آگاہ ہوں جتنا توحید قیامت اور عبادات کے مشہور مسائل سے، یہ لکھنی مضمونہ خیز حرکت ہے کہ ختم نبوت ایسی حقیقت کیلئے جس کی قرآن میں وضاحت ہے جو حدیث میں صراحةً سے مذکور ہے۔ ہم مجبور ہوں کہ فکر و استدلال کی متعین را ہوں سے ہٹ کر ادھر ادھر کیکھیں اور چند لوگوں کے اقوال پر اس کی بنیاد رکھیں۔

ان اقوال کی حیثیت ہمارے ہاں صرف اتنی ہے کہ یہ جن بزرگوں کی طرف

منسوب ہیں، ہم ان کے مرتبہ علمی اور مقام عملی کے قائل ہیں اور مانتے ہیں کہ ان کے عقائد امت کے مسلمات سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ بالخصوص ایسے مسائل میں جن کی حیثیت اصول اور بنیاد کی ہے۔ امت کے ذہن سے علیحدہ ان کا ذہن ہونا قرینِ عقل نہیں۔ اس مفروضے کی روشنی میں ہم ان کے اقوال پر نظر ڈالیں گے۔

ایک اور بات صوفیا کے سلسلہ میں یہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان میں بعض لوگ ایسے ہیں، جن پر سکر و جذب کی کیفیتیں اتنی غالب رہتی ہیں اور عمل و صحواتا مغلوب کہ وہ استواری کے ساتھ دینی مسائل پر غور کر ہی نہیں سکتے ان کے شطحیات کے ہم قطعی پابند نہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کی ذمہ داری صرف ان پر ہے۔ ہم اتنا کہ کر عہدہ برآ ہو جائیں گے۔ کہ ان سے بادی انظر میں جو معنی ذہن میں آتے ہیں وہ ظاہر شریعت کے ساتھ میل نہیں کھاتے اور یہ کہ ان کا معاملہ اللہ سے ہے۔

نبوت کا اطلاق

باقي رہے وہ صوفیا اور بزرگ جو صحود استحضار سے بہرہ مندہ ہیں توہ البتہ ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ ہم نے جہاں تک ان کی کتابوں پر غور کیا ہے کہیں ایک مقام بھی ان میں ایسا نہیں ملا جس میں یہ مذکور ہو کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی شخص اپنے الہامات یا بزرگی کے باعث اس لائق ہے کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو۔ جو صاحبِ دعوت ہونے کا اتحقاق رکھتا ہو جو ایمان و کفر کے درمیان حد فاصل ہو جس کا ماننا تقاضاً اسلام ہوا اور جس کا انکار نفسِ اسلام کے انکار کے مترادف ہو یا وہ ولایت کو البتہ جاری سمجھتے ہیں۔ اور پھر ولایت ہی کے ایک پہلو کو نبوت سے تعبیر کرتے ہیں علمی اصطلاح میں آپ یوں سمجھئے کہ نبوت کا ایک اطلاق ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ

ولایت کی قسم ہے۔ رسالت کی قسم نہیں لہذا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ نبوت کے فیوض جاری ہیں تو ان کی مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ ولایت جاری ہے۔ پھر اس نبوت کو جس کو نبوت ولایت کہنا چاہئے اس نبوت سے جس کامانہا ہر مسلمان پر ضروری ہے لفظ تشریع سے جدا کرتے ہیں۔ یعنی ایک نبوت وہ ہے جو اس درجے کی ہے۔ کہ کوئی دوسرا شخص اس کو ماننے کا مکلف نہیں اور ایک وہ ہے جس کامانہا ہر شخص پر شرعاً ضروری ہے۔ یہ دوسری قسم کی نبوت ان کے ہاں نبوت التشریع کہلاتی ہے۔ امام شعرانی ”فرماتے ہیں۔

الْفَرْقُ بَيْنَهُمَا هُوَ أَنَّ النَّبِيَّ إِذَا لَقِيَ الرُّوحَ شَيْئًا أَقْتَصَرَ
بِهِ ذَلِكَ النَّبِيُّ عَلَى نَفْسِهِ خَاصَةً وَيَحْرُمُ عَلَيْهِ أَنْ يَبْلُغَ غَيْرَهُ ثُمَّ إِنَّ
قَبِيلَ لَهُ بَلَغَ مَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ إِمَّا لِطَائِفَةٍ مَخْصُوصَةٍ كَسَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ أَوْ
عَامَةً لَمْ يَكُنْ ذَلِكَ إِلَّا لِمُحَمَّدٍ سُمِّيَ بِهَذَا الْوَجْهِ رَسُولًا وَإِنَّ لَمْ
يَخُصَّ فِي نَفْسِهِ بِحُكْمٍ لَا يَكُونَ لِلَّآءُولِيَاءِ (الیواقیت الجواہر صفحہ ۲۵)
دونوں میں فرق یہ ہے کہ نبی پر جب وحی ہوتی ہے۔ توہ اس کو صرف اپنی
ذات تک محدود رکھتا ہے۔ اس کے لئے یہ ناجائز ہے کہ دوسروں کو ان الہامات کی
دعوت دے اور اگر اس کو ان الہامات کی دعوت پر مامور کیا گیا ہے تو وہ (ہماری
اصطلاح میں) رسول ہے چاہے اس کا حلقہ چند لوگوں تک وسیع ہو، چاہے ساری
دنیا تک ممتد ہو اور ایسا رسول تمام کی رشد و ہدایت کیلئے ماورہ بوجز آنحضرت ﷺ
کے اور کوئی نہیں آپ ﷺ کو اسی مناسبت سے رسول کہا گیا ہے۔ کہ آپ ﷺ نے
کسی حکم کی تبلیغ کو اپنی ذات تک محدود کر کے نہیں رکھا یہی نبوت تشریعی ہے جو

اولیاء کو حاصل ہوتی ”۔

اس پوری عبارت پر غور فرمائیے۔ خصوصاً خط کشیدہ الفاظ پر، تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ صوفیا کے ہاں نبوت کا ایک اپنا اطلاق ہے۔ جس میں اولیاء امت داخل ہیں۔ ورنہ جہاں ایسی نبوت کا تعلق ہے۔ جس کا ماننا دوسروں کیلئے ضروری ہے اور جس کو وہ رسالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو حضرت امام کے نزدیک ان کے دونوں کو اڑ آنحضرت ﷺ پر بند ہیں۔

قد ختم اللہ تعالیٰ بشرع محمد صلی اللہ علیہ وسلم جميع الشرائع ولا رسول بعده يشرع ولا نبی بعده يرسل اليه بشرع يتبع بدبه فينفسه انما يتبع الناس بشريعة الی يوم القيمة

(الیواقیت الجواہر جلد ۲ ص ۳۷)

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی شریعت سے جملہ شرائع ختم کر دیا ہے اب نہ تو کوئی نبی آنے والا ہے۔ اور نہ کوئی رسول بھیجا جائے گا۔ جسے شریعت سے بہرہ مند کر کے مبouth کیا گیا ہو۔ اب تو قیامت تک کیلئے لوگ آنحضرت ﷺ کی شریعت ہی کو ماننے کے پابند ہیں۔“

اب رہی یہ بحث کہ صوفیائے کرام نے نبوت کے معنی میں یہ توسعہ کیوں فرمائی۔ کہ اس کا اطلاق اولیاء پر بھی ہو سکے تو یہ ایک لطیف بحث ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری صوفیاء کے اس تصور پر عائد ہوتی ہے۔ جو انہوں نے نبوت سے متعلق قائم کیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ کمالات نبوت ایسی چیز ہے جو سعی اور کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے زہور یا ضست اور اللہ کی خوشنودی کے حصول میں جدوجہد انسان کو اس حد تک پہنچادیتی ہے کہ اس کا آئینہ دل اتنا مغل اور شفاف ہو

جائے کہ غیب کے انوار و تجلیات کی جھلک اس پر منعکس ہوان کا دل مہبٹ وحی قرار پائے اور اس کے کان طرح طرح کی آوازیں سنیں۔ یعنی مقامِ نبوت سے مراد عمل و فکر کی وہ صلاحیتیں ہیں جو بشریت کی معراج ہیں ان تک رسائی کے دروازے امت محمدیہ ﷺ پر بلاشبہ کھلے ہیں شوقِ عبودیت اور ذوقِ عبادت شرط ہے۔ جوباتِ ختمِ نبوت کی تصریحات کے بعد ہماری دسترس سے باہر ہے وہ نبوت کا حصول ہے کہ اس کا تعلق یکسر اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے ہے۔ یعنی یہ اس پر موقوف ہے کہ اس کی نگاہ کرم اس عہدِ جلیلہ کیلئے اپنے کسی بندے کوچن لے جس میں نبوت کی صلاحیتیں پہلے سے موجود ہوں اور جو مقامِ نبوت پر پہلے سے فائز ہواب چونکہ نامزدگی کا یہ سلسلہ بند ہے اس لئے کوئی شخص ان معنوں میں تو نبی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کا ماننا دوسروں کیلئے ضروری ہو اور اس کے الہامات دوسروں پر شرعاً جحت ہوں۔ البتہ مقامِ نبوت یا نبوت کی صلاحیتیں اب بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ نبوت کے اس تصور سے چونکہ نبوت مصطلحہ اور ولایت کے اس مقام میں بجز نامزدگی کے اور کوئی بنیادی فرق نہیں رہتا اس لئے وہ حق بجانب ہیں کہ اس کو بھی ایک طرح کی نبوت قرار دیں کہ دونوں فطرت و حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور امتیاز جو ہے وہ صرف رتبہ و اعزاز کا ہے نوعیت کا نہیں یا یوں کہئے کہ اصطلاحی ہے۔

نبوت و ولایت میں فرق

ہمارے نزدیک یہ تصور نبوت کا درست نہیں۔ ولایت و نبوت میں جو فرق ہے، وہ اس طرح کا نہیں ہے جیسے ایک عالم اور حکیم میں ہوتا ہے، یا فقیہہ و مجتہد میں ہوتا ہے بلکہ یہ فرق نوعیت کا ہے۔ مدرج یا رتبہ کا نہیں۔ نبوت اپنے مأخذ کے اعتبار

سے جس سے وہ براہ راست استفادہ کرتی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کے نقطہ نظر سے اور اپنے طریق کار کے لحاظ سے ولایت سے یکسر مختلف شے ہے۔ نبوت کا مأخذ منشاء، الہی ہے۔ وَمَا يَنْطِلُقُ عَنِ الْهَوْىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْىٌ يَوْخىٰ (النجم: ۴۲) اور ولایت کا مأخذ کتاب و سنت ہے۔ اور وہ واردات و احوال جن کو الہامات و وحی سے تعبیر کرتے ہیں ایسے نہیں ہیں کہ ان پر وثوق کیا جاسکے۔ ابھی دل کا سائنس اتنا ترقی پذیر نہیں ہوا کہ الہام و وحی کی پوری پوری تشرع ہو سکے تاہم اتنا تو بہرآئینہ طے ہے کہ اس وحی میں وہ قطعیت نہیں جو وحی نبوت کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ یہاں یہ احتمال برابر ہٹلتا ہے کہ دل تک وحی والہام کی لہروں اور موجودوں کے لے جانے والے کہیں یہ خود حضرت دل ہی نہ ہوں، کہیں یہ وجدان کی کار فرمائی نہ ہو کہ کشوف کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ دل کی پہنائیاں اس درجہ وسیع اور ناقابل فہم ہیں کہ یہ سب کچھ ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود صوفیائے کرام نے اپنے الہامات کو دوسروں کیلئے جمعت نہیں بھرا یا۔

صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی نبی ظاہر و باطن کے اس حسن و جمال اور اعتدال و توازن کو لے کر آتا ہے کہ غیر نبی کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو پاتا۔ یعنی یہ وہ حضرات ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ انتخاب اول روز سے چن لیتی ہے۔ غیر معمولی صلاحیتوں سے انہیں بہرہ مند کرتی ہے اور تربیت کا وہ اہتمام کرتی ہے جو دوسروں کو میسر نہیں ہوتا اللہ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رسَالَتَهُ ط (الانعام: ۱۲۴) نبوت کا طریق کاری یہ ہے کہ ایک شخص اپنے نفس کی فکر سے فارغ اس غم میں گھل رہا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کیونکر کی جائے اور ولی بے چارہ اپنے ہی ہموم و افکار سے مخلصی نہیں حاصل کر سکا۔ نبی ایک روشنی رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس سے

دنیا بھر کی تاریکیوں کو دور کرے۔ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلْمَةِ إِلَى النُّورِ (البقرة: ٢٥٧) ”اور ان کو تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں داخل کرتا ہے۔“ اور ولی کتاب و سنت کی روشنی تو رکھتا ہے لیکن نفس عمل کی تاریکیوں سے برابر دوچار ہے۔

اجرائے نبوت پر کن آیتوں سے استدلال کیا جاتا ہے

اب ذیل میں ہم ان تمام آیات کو درج کرتے ہیں۔ جن پر اجرائے نبوت کی عمارت چنی گئی ہے۔ یہاں خصوصیت سے یہ اصول مدنظر رکھنا چاہئے کہ جو بات مابہ النزاع ہے وہ مطلقاً اجرائے نبوت یا اس کے متعلقات نہیں۔ کیونکہ نبوت کی گاڑی تو بہر آئینہ ہزاروں برس چلتی ہی رہی ہے، بلکہ وہ نبوت ہے جو آنحضرت ﷺ کے بعد ہو۔ یعنی ثابت یہ کرنا ہے کہ دین مکمل نہیں اور ابھی کئی اور راز ہیں جو سینہء جبریل میں پہاں ہیں۔ بتانایہ ہے کہ اسلام ہی آخری دین نہیں، نبوت، وحی اور الہام کی اور کئی کڑیاں بھی ہیں جو انسان کے سامنے آنے والی ہیں۔ ظل اور بروز اور رنگ و انکاس کے ہم قائل نہیں یہاں تقسیم دوٹوک ہے یا ایک نبی ہے یا وہ نبی نہیں ہے اور اگر باوجود ادعائے نبوت کے وہ نبی نہیں ہے توہ صرف یہی نہیں کہ نبی نہیں ہے۔ مکار ہے۔ اور اگر مکار نہیں ہے تو بے وقوف ہے جب صاف، روشن اور واضح راستوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک شخص نیز ہمی اور خدماء رکھیوں میں چکر لگاتا ہے۔ تو وہ چور ہے۔ بات صرف اتنی ہی ہے۔ کہ اسلام اپنے تقاضوں کے ساتھ مکمل ہو چکا ہے۔ اور سینہء جبریل کے تمام راز ربویت کبریٰ نے اگلوانے ہیں۔ اب جہاں تک انسانی رشد و ہدایت کا تعلق ہے۔ کوئی نئی بات کہنے کی نہیں

رہی اور نہ کوئی راز و معہدی باقی رہ گیا ہے۔ جس کے حل والقاء کیلئے جبریل کو سینہ رسالت کی تلاش ہو۔

خیر یہ بحث تو آئندہ سطور میں آئے گی، سردست صرف یہ کہنا ہے کہ ان آئتوں کو بار بار پڑھئے اور دیکھئے کہ ان میں کہیں یہ موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے بعد بھی رسالت کا باقاعدہ سلسلہ جاری ہے، یا وحی والہام کے کواڑ کھلے ہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ دعویٰ و دلیل میں مطابقت ہونا چاہئے اور استدلال و استنباط کی اس ہمہ گیر لغوش سے بچنا چاہئے کہ عمومات سے مخصوص و متعین دعویٰ ثابت کیا جائے۔ بات بالکل واضح ہے اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی انسان کو دین کی جامعیت و اکملیت کا اطمینان حاصل نہ ہو اور وہ برابر نئی نئی نبوتوں اور رسالتوں کا منتظر ہے یادِ دین کا مزاج ہی ایسا ہے کہ ہر ہر آن میں اس میں تغیر و تبدلی کی گنجائش نکلتی رہتی ہے تو اس کو بڑی وضاحت اور تعین کے ساتھ قرآن میں مذکور ہونا تھا۔ ظل و بروز کے چور دروازوں کی حاجت نہیں۔ جہاں ختم نبوت کی کھلی کھلی آیتیں ہیں وہاں اجرائے نبوت کی آیتیں بھی اتنا ہی تین اور واضح ہونا چاہئیں تھیں۔ بلکہ صحیح موقف تو یہ ہے کہ ختم نبوت اور اس کے متعلقات کو اور ان تمام پیرایہ بیان کو ہونا چاہئے تھا جن سے ختم نبوت کا مسئلہ پر پوری پوری روشنی پڑتی ہے۔

کیونکہ دو ہی تو شرعاً موقف ہو سکتے ہیں یا نبوت آنحضرت ﷺ پر ختم ہے اور یا ختم نہیں ہے۔ بیچ کا کوئی رستہ نہیں۔ ظل و بروز کی بحث قطعاً غیر متعلق اور عجیب ہے اگر ختم نبوت کا مسئلہ صحیح ہے اور واضح ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے تو پھر اللہ کی کتاب میں اجرائے نبوت کی مثال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ چاہئے کہ

— ہر زانیت نے زاویوں سے

اطمینان سے کتاب و سنت پر عمل کرتے جائیں اور کسی دبدبہ کو دل میں نہ لائیں۔ اور اگر نبوت کا سلسلہ جاری ہے تو پھر یہ تمام آیات و احادیث معاذ اللہ بے مصرف ہو کے رہ جاتی ہیں اور ان میں جو خلیج پیدا ہوتی ہے اسے کسی تاویل سے پامنا ممکن ہو جاتا ہے آیات یہ ہیں۔

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ
الْخَيْثَ مِنَ الطَّيْبِ طَ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَىٰ الغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ
يَعْلَمُ مِنْ رَسُولِهِ مَنْ يَشَاءُ صَفَّا مِنْ نَوْا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۝ وَإِنْ تُؤْمِنُوا
وَتَتَقَوَّلُوكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ (آل عمران: ۱۷۹)

منافقو! اللہ ایسا نہیں ہے کہ جس حال میں تم ہو اچھے برے کی تمیز کئے بدوس اسی حال پر مومنوں کو تمہارے ساتھ ملا جلا رہے دے اور اللہ ایسا بھی نہیں کہ تم کو غیب کی باتیں بتادے ہاں! اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے انتخاب فرمایتا ہے (اور ان کو بقدر مناسب بتادیتا ہے) تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاوے (اور غیب کی ثوہ کے پیچھے نہ پڑو) اور اگر ایمان لاوے گے اور نفاق سے بچتے رہو گے تو تم کو بڑا جرملے گا۔

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ طَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ طَ
بَصِيرٌ ۝ (الحج: ۷۵)

”اللہ فرشتوں میں سے بعض کو احکام پہنچانے کیلئے انتخاب فرمایتا ہے اور اس طرح بعض کو آدمیوں سے بھی کیونکہ اللہ سب کی سنتا اور دیکھتا ہے۔“

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
مِنَ النَّبِيِّنَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشَّهِدَاءِ وَالصَّلِحِينَ ۝ وَحَسْنَ أُولَئِكَ

— مزائیت نے زادیوں سے

رفیقاً (النساء: ٦٩)

”جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کہا مانے تو ایسے ہی لوگ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (بڑے بڑے) احسانات کے لیے نبی اور صدیق اور شہید اور دوسرے نیک بندے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔“

يَبْنِيَ آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ أَيْتَنِيٰ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْرَنُونَ
۝
(الاعراف: ٣٥)

”اے بنی آدم! جب کبھی تم ہی میں سے ہمارے پیغمبر تمہارے پاس پہنچیں اور ہمارے احکام تم کو پڑھ پڑھ کر سنائیں تو ان کا کہا مان لینا کیونکہ وہ جو شخص ان کے کہنے کے مطابق پر ہیزگاری اختیار کرے گا اور اپنی حالت کی اصلاح کرے گا تو قیامت کے دن ان پر نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ آزرده خاطر ہوں گے۔“

يَا إِيَّاهَا الرَّسُولُ كُلُّوَامِنَ الطَّيِّبَاتِ وَأَعْمَلُوا صَالِحَاتٍ إِنَّمَا تَعْمَلُونَ عَلَيْمٌ
(ومونون: ٥١)

”ہم اپنے پیغمبروں سے بھی ارشاد کرتے رہے ہیں کہ اے گروہ پیغمبر اس ستری چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ تم جیسے عمل کرتے ہو، ہم ان سب سے واقف ہیں۔“

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلٍ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا
۝

(المؤمن: ۳۴)

”اور پہلے یوسف ﷺ کھلے کھلے احکام لے کر تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں تو جو احکام وہ تمہارے پالے کر آئے تھے تم اس میں شک ہی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم ان کے مرے پیچھے کہنے لگے کہ اس کا جھگڑا تو خدا نے چکا دیا اور اب اس کے بعد کبھی اللہ کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔“

وَإِنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَّنْتُمُ الَّذِي يَبْعَثُ اللَّهُ أَحَدًا (الجن: ۷)
”اور جس طرح تم جنات کو خیال تھا نبی آدم کو بھی خیال ہوا کہ خدا کبھی کسی کو پیغمبر بنانا کرنے نہیں بھیجے گا۔“

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (بنی اسرائیل: ۱۵)
”اور جب تک ہم رسول بھیج کر اتمامِ جحث نہ کر لیں۔ کسی کو اس کے گناہ کی سزا نہیں دیا کرتے۔“

یہ ہیں وہ تمام آیات جن سے مرزاںی دوست ناے نبوت پر استدلال کرنا چاہتے ہیں، ان پر مجموعی نظر ڈالنے سے بھی اس طرح کے حقائق سامنے نظر نہیں آتے کہ نبوت کے نضرات ابھی باقی ہیں یا یہ کہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی جاری ہے۔ مدعا و مطلوب کی وحدت اور ارتقاء یا تعین ووضاحت جوابات و دعوے کے لئے ضروری ہے ان میں بالکل نہیں پائی جاتی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مطالب آیات ہیں جن میں کوئی قدر مشترک نہیں ہر جگہ ایک نئی حقیقت اور نیا مسئلہ ہے جسے بیان کرنا مقصود ہے۔

پہلی آیت کو مثلاً لیجئے اس میں مدینہ کے منافقین کا تذکرہ ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کر تمہارا یہ خلام مسلمانوں کو ہمیشہ دھوکا دے سکے گا، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ پاکباز

گروہ اور حبیث باطن رکھنے والے آخر کار جدا نظر آئیں، چنانچہ خود تمہارے انہاں، جیسے جہاد سے تخلف، یا جذبہ جہاد سے محرومی وغیرہ ایسی باتیں ہیں کہ جو تمہیں عام مسلمانوں سے ممیز کر کے رہیں گی، باقی رہایہ کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ تم میں سے ایک آدمی کا نام لے کر کیوں نہیں بتاتا کہ فلاں فلاں منافق ہے تو اس لئے کہ یہ جاننا صرف انبیاء علیہم السلام کا کام ہے تمہارا نہیں۔ تمہارے لئے تو یہی زیبا ہے کہ بغیر غیب کی ثنوں کے اللہ کے نبیوں پر ایمان لا اور نفاق سے احتراز کرو اور یہ فرمایا کہ ”اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے انتخاب فرمایتا ہے، تو یہ کوئی اصول نہیں بلکہ سابقہ عادت کی حکایت ہے اس طرح یہ بتانا یہ مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ماننا نہیں، بلکہ مخصوص ہے۔ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کو۔

دوسری آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو اللہ کے ساتھ دوسری کو شریک گردانتے ہیں، چنانچہ اس لئے قبل کے آئیوں میں ان کے ٹھہرائے ہوئے معبودوں کی بے چارگی کو بڑی اچھی طرح واضح کیا ہے، فرمایا ”جن کی تم پر پتش کرتے ہو، وہ اتنے عاجز ہیں کہ ایک کمکھی بھی تو نہیں بن سکتے۔ یہی نہیں بلکہ اگر کمکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو یہ سب مل کر بھی اس کو چھڑا نہیں سکتے۔“ اس کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ فرشتوں اور انسانوں کو خلعت رسالت سے نوازتا ہے۔ لہذا یہ دونوں اس کے ایچھی تو ہو سکتے ہیں خدا نہیں۔

سورہ نساء کی پوچھی آیت میں ذکر ہی قیامت کی رفاقت کا ہے اسی لئے وَحَسْنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا فرمایا ”اس میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ لوگ کسب و اطاعت سے نہ جائیں گے۔ شبہ غالباً حرف عطف سے پیدا ہوا ہے حالانکہ اس میں

— مِرْزَائِیت نے زاویوں سے

صرف اتنا اشتراک کلفاہت کرتا ہے جو سب کو فی الجملہ شامل ہوا اور وہ ہے رفاقت اخروی، یہ ضروری نہیں کہ ہر ہر بات میں یہ معطوفات بھم برابر کے شریک بھی ہوں، پس رفاقت اخروی سے یہ کب لازم آتا ہے کہ نبوت بھی آنحضرت ﷺ کے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔

ہم اس پر بحث کر چکے ہیں، کہ نبوت اطاعت کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ انہیاً علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت نتیجہ ہوتی ہے، ان کی نبوت کا، یعنی نبوت اللہ تعالیٰ کا ایک انعام تو ہے لیکن یہ انعام پیغام اور دعوت کی ایسی صلاحیتوں کو پیدا کرنے کے بعد ملتا ہے جن کا وجود خود اللہ تعالیٰ کے انتخاب پر موقوف ہے۔

چوتھی آیت سے استدلال صرف اس صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ کھلی تحریف کا ارتکاب کیا جائے، یا بنی آدم کا الفاظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولین اولاد ہے، قرآن کھول کر اسی سورہ میں قبل کی آیات پر نظر ڈالو، برابر تین جگہ یہی لفظ آیا ہے، اور تینوں جگہ بنی آدم علیہ السلام کو مناطب کر کے ابتدائی تعلیمات سے آگاہ فرمایا ہے پہلی جگہ لباس پہننے کی ہدایت فرمائی ہے۔

يَبْنِي أَدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يَوْمَ الْحِجَّةِ سَوَاتِكُمْ وَرِيشَأَهُ

(الاعراف: ۲۶)

”اے بنی آدم“ ہم نے تمہاری ضرورت کیلئے لباس اتارا کہ تم اس سے اپنے جسم کو ڈھانپ سکو“

دوسری جگہ شیطان کے دعاوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے جس نے تمہاری لڑائی ہے۔

يَبْنِي أَدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبْوَيْكُمْ مَنِ الْجَنَّةِ

(الاعراف: ۲۷)

”اے بنی آدم! دیکھو شیطان تمہیں اس طرح آزمائش میں نہ ڈالے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکال باہر کیا۔“

بَيْنَيْنِ آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

(اے بنی آدم! نماز کے وقت کپڑے پہن لیا کرو۔)

اور اس آیت میں انہیں یہ بتایا کہ میرے بعد ان بیانات علیہم الصلوٰۃ والسلام آتے رہیں گے ان کو ضرور مانتا، چنانچہ وہ آتے رہے یہاں تک کہ اس کی مصلحت نے اس کے دروازے بند کر دیئے۔

یہی حال پانچویں آیت کا ہے کہ بلاشدید تصرف کے اجرائے نبوت پر استدلال سخت دشوار ہے، بتانا یہ مقصود ہے کہ ان بیانات علیہم الصلوٰۃ والسلام جب بھی آئے ہیں انہوں نے اکل حلال اور عمل صالح کی طرف ہی بلا یا ہے۔

چھٹی اور ساتویں آیت سے استدلال تو بالکل ہی مضحکہ خیز ہو گیا ہے، قرآن حکیم یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قوم نے نہ ضرف یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو خوش ہو کر کہا کہ چلو چھٹی ہوئی اب تو کوئی رسول نہیں آئے گا جو ہمیں ہمارے گناہوں پر ٹوکے اور ہماری خواہشات کے خلاف رشد و ہدایت کی را ہوں پر ڈالے یعنی ان کی خواہش از راہ کفر و انکار یتھی کہ اللہ کا کوئی رسول آئندہ نہ آنے پائے اور ہماری از راہ ایمان یہ ہے کہ نبوت کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور اس لئے اب کوئی جعل ساز ہماری سمع خراشی نہ کرے داعیات کفر و انکار اور داعیات ختم و تکمیل میں بڑا فرق ہے۔ یہی حال جنوں کا تھا کہ ان میں بھی کفر و انکار کی وجہ سے مایوسی کا عالم طاری تھا کسی نص

دینی کی بناء پر نہیں، اس لئے فرمایا کہ میں اس مایوسی کو ختم کرنے کیلئے آگیا ہوں۔ آٹھویں آیت سے اجرائے نبوت پر یوں استدلال فرمایا گیا ہے چونکہ خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ اتمامِ جحت سے پہلے عذاب نہیں بھیجتا اس لئے اب جبکہ طرح طرح کے عذاب آ رہے ہیں، میں اتمامِ جحت کی قطعی ضرورت ہے اور وہ اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ ایک نبی نہ آ جائے لہذا نبوتِ جدیدہ کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ اس گوناگون عذابوں کی کوئی توجیہہ بیان کی جاسکے۔ حالانکہ اس آیت میں اس کے آنے کا کہیں ذکر نہیں جو فرمایا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اللہ کا عذاب اتمامِ جحت کے بعد آتا ہے اور کون کہتا ہے کہ وہ موجود نہیں۔ کیا اسلام اللہ کی سب سے بڑی جحت نہیں؟ کیا ساری تکلیفیں اور یہ سارے عذاب بنی آدم پر اس لئے نہیں آ رہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو جھلکار ہے ہیں!



فیصلہ کن تنقیح

- ظلی نبوت کا تصور کیونکر پیدا ہوا ○
- بائل میں نبوت کا تصور ○
- زندگی متحرک ہے ○
- صحیفہ آدم کا جنم ○
- زندگی متحرک تو ہے لیکن ○
- ایک تمثیل ○
- دنیا کا پہلا آفاقی مذہب ○
- اسلام سے پہلے ○
- عیسائیت کیونکر پیدا ہوئی؟ ○
- مسائل کا فیصلہ کن انداز ○
- میکیل کے معنی ○
- دوسرا محاذ ○
- کوئی انسان معصوم نہیں ○
- مذہب کا مطالبہ ○
- عصمت آئمہ کا عقیدہ کیونکر ○
- شیعیت، اسلام کے خلاف سازش ○
- فرقی مراتب ○
- ختم نبوت ایک ثابت عقیدہ ○

فیصلہ کن تنقیح

کیا نبوت صرف اعزاز ہے؟ یہاں تک تو بحث کارنگ منقولی تھا اب یہ دیکھنا ہے کہ عقلی چھان بین ہمیں کن متانج تک پہنچاتی ہے۔ اس سلسلہ کی فیصلہ کن تنقیح یہ ہے کہ نبوت کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی کیا یہ صرف ایک طرح کا اعزاز یا شرف اور فضل ہے جس سے اللہ نے اپنے بندوں کو مختلف زمانوں میں نوازا ہے یا اس کے سامنے کوئی اصلاحی غرض بھی ہے۔ پھر اس پر غور کرنا ہے کہ کیا یہ اصلاحی غرض ایسے ڈھنگ کی ہے کہ کبھی نہ کبھی تکمیل پذیر ہو سکے یا اس کا مزاج ہی اس انداز کا ہے کہ ہمیشہ تشنہ اور نامکمل رہے۔ اجرائے نبوت کے تصور میں ساری خرابی اسی ایک تنقیح کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر صورتِ مسئلہ یہی ہے کہ نبوت محض ایک طرح کی بخشش و عطا ہے اور اس کے سامنے زندگی کا ایسا چوکھتا نہیں ہے جسے مکمل کرنا مقصود ہے یا زندگی چوکھتا ہی ایسا ہے کہ زمانے کے تغیرات سے وہ روپ بدلتا رہتا ہے تو یہ عقیدہ بلاشبہ صحیح ہو گا کہ نبوت کے کواڑ کھلے ہیں اور اگر اس کے برلنگس نبوت سے متعلق تصور یہ ہے کہ اس سے کچھ مقصود ہے اور وہ مقصود ارتقاء کے ایک موٹپر اپنے تمام مضررات کے ساتھ اس طرح چشم نبوت کے سامنے کھل کر آ جاتا ہے کہ پھر اس کی تکمیل و اتمام میں کوئی زحمت محسوس نہیں ہوتی۔ تب ختم نبوت کے اصول کو صحیح مانا پڑے گا یعنی اگر انسانی معاشرہ کا ڈھنگ یہ ہے کہ یہ کسی منزل پر بھی نہیں

تلے اور جامع احکام کا محتاج نہیں ہے اور خود خیر و صواب کی قدر میں ہمیشہ تغیر پذیر اور متبدل رہی ہیں تو اجرائے نبوت کے عقیدہ کو ماننے کے سوا اور کوئی چارہ کا رہیں رہتا لیکن اگر انسانی معاشرہ طفولیت سے گذر کر بلوغ کی تمام ممکن منزلیں طے کر چکا ہے اور مسائل زیر بحث کے تمام پہلوں کو نہر کر انسان کے سامنے آ گئے ہیں اور تہذیب و ثقاوت کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا کہ جو اس وقت نظروں سے او جھل ہو تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ ختم نبوت ہی کے مضبوط حصار میں انسانی فکر و عمل کے لئے عافیت مضر ہے ورنہ یہ خطرہ ہے کہ نفس نبوت ہی پر سے اعتقاد نہ اٹھ جائے کیونکہ آخر میں اجرائے نبوت کے یہی معنی تو ہوتے ہیں کہ اخلاقی و دینی قدر میں اضافی اور غیر حقیقی ہیں جن کا زمانہ کے ارتقاء اور تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا قطعی ضروری ہے۔

یہ واضح رہے کہ ہمارے سامنے وہی اصطلاحی معنی ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں اس کا ظالی اور بروزی ظہور قطعی خارج از بحث ہے کیونکہ اگر بر بنائے بخشش و عطا ہی نبوت کا اجراء ضروری تھہرتا ہے تو پھر اس بخشش و عطا کو بہرآئینہ مکمل ہی ہونا چاہئے چنانچہ قرآن حکیم میں ایسے انبیاء علیہم السلام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جن کی نبوت منفرد اور مستقل بالذات نہ ہو بلکہ کسی بڑی نبوت کی شاخ یا فرع ہو۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ ہی کو دیکھئے ایک زمانہ میں ایک ہی قوم کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں پھر ان میں عمروں کا تفاوت بھی اچھا خاصاً موجود ہے بلکہ نبوت کی عمر میں بھی تفاوت ہے اور نبوت بھی حضرت موسیٰ کی سفارش پر ملی ہے تاہم جب نبوت سے سرفراز کرنے کا ذکر آتا ہے تو قرآن دونوں کی شخصیت کو الگ الگ اور جدا جدا قرار دیتا ہے۔

”ہم نے ان دونوں کو کھلی اور واضح کتاب عطا کی،“ -

ظلیٰ نبوت کا تصور کیونکر پیدا ہوا

ظلیٰ و بروزی کا یہ غیر قرآنی تصور جس میں ایک نبی تو اصلی اور حقیق ہوا اور دوسرا بالتعیٰ، بالکل ضمنی اور تابع قرار پائے، اصل میں مرزا صاحب کے ذہن میں تصوف کی راہوں سے آیا اور بابل کے مطالعہ نے اس کی مزید تائید فراہم کی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جن لوگوں نے عہد نامہ قدیم میں اننبیاء علیہم السلام کو کارروائی درکاویں ایک ہی زمانہ میں اور ایک ہی قوم میں تبلیغ و اشاعت کے کام میں مصروف دیکھا ہے۔ انہیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا یہ محض اس کی بخشش کی ارزانیاں ہیں یا یہ بات ہے کہ ان قوموں سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبت تھی اس ضمن میں یہ نکتہ نہ بھولے کہ یہیں سے ایک جذباتی سی خواہش دلوں میں یوں ابھری کہ امت محمد ﷺ تو آنحضرت ﷺ کے بعد ایک پیغمبر کو ترس ترس جائے اور ان قوموں پر یہ عنایت ہو کہ انوار و برکات کی ایک بھی موجود ہے جو دلوں کی صفائی اور کیرکٹر کی سترہائی میں لگی ہے پھر اس کی توجیہہ ذہن میں آئی کہ اصل میں اس پوری جماعت میں حقیقی پیغمبر تو ایک ہی ہوتا تھا باقی ان کے نائب اور تابع ہوتے تھے جنہیں اطاعت و ریاست کی کثرت کے پیش نظر ضمناً منصب نبوت سے سرفراز ا جاتا۔ لہذا امت محمدیہ ﷺ میں بھی یہ گنجائش رہنا چاہئے کہ اس میں بھی بے شمار لوگ اپنی نیکی و پارسائی کی وجہ سے نبی کہلامیں اور امت کی اصلاح پر مامور ہوں یہ ہے وہ نفیسیاتی خاکہ جو مرزا صاحب کے ذہن میں پیدا ہوا اور ظلیٰ نبوت کا محرك بنا۔ حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا تصور اس تصور سے کوئی میل نہیں رکھاتا جو قرآن کے

سامنے ہے کیونکہ اس میں اتنی لپک ہے کہ علماء پر بھی انبیاء کا اطلاق ہو سکے۔
بابل میں نبوت کا تصور

بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جب دینی جذبہ کی درجہ غایت کی ہوئی اور لوگ حضرت موسیٰ کی تعلیمات کو قریب قریب بھول گئے تو حضرت سموئیل نے احیاء دین کی غرض سے ”الرامۃ“ میں عظیم الشان تبلیغی مدرسہ قائم کیا اور ان لوگوں کو جنہوں نے یہاں تعلیم پائی اور اپنے آپ کو تبلیغی خدمات کیلئے وقف کیا۔ ”انبیاء کے میٹے“ قرار دیا پھر اسی طرح کے مدرسے بھی بیت اہل ریحہ اور جل جمال میں قائم ہوئے ان میں طلباء کو تبلیغ و اشاعت کیلئے تیار کیا جاتا یہی لوگ جب ہزاروں کی تعداد میں فارغ ہو کر نکلے تو لوگوں نے انہیں انبیاء ہی کے نام سے موسم کرنا شروع کر دیا اور پھر یہ اصطلاح اتنی عام ہو گئی کہ یہودیوں کی تباہی کے بعد جب دوبارہ بابل کو مرتب کیا گیا تو ان کو انبیاء ہی رہنے دیا گیا۔

ہم یوں بھی ظلی نبوت کو درخواستنا نہیں سمجھتے کہ عقلاء ختم نبوت سے جو اصول متصادم ہے وہ مسئلہ ارتقاء کا ہے اور ارتقاء قطعی اس پر قافع نہیں کہ زندگی کے اصولوں اور بنیادوں کو بد لے بغیر برائے نام ایک منصب جاری رہے۔ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر زمانہ میں پوری مذہبی زندگی کا جائزہ لیا جائے اور اس کو وقت کے رحماناں کے مطابق بدل جائے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ارتقاء سرے سے مذہب کی اس حیثیت ہی کو نہیں مانتا کہ وہ زندگی کے حدود کو متعین کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر اجرائے نبوت کے یہ معنی ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شریعت آنا چاہئے اور ہر زمانے میں ایک نیا دستور وضع ہونا چاہئے تب تو اس کے کچھ معنی بھی ہیں۔ اگرچہ غلط ہیں اور اگر عملًا

قیامت تک اسلام ہی کی فرمازروائی کو تسلیم کرنا ہے اور آنحضرت ﷺ کو آخر کار سند و جلت ماننا ہے تو پھر اس قیل و قال بے ہودہ کافائدہ؟ مرزا صاحب کو اپنی اس کمزور پوزیشن کا احساس تھا کہ بغیر شریعت کے نبوت کا ڈھونگ کیا معنے؟ اس لئے عام طور پر اگرچہ وہ مصلحتاً زیادہ نہیں پہلیتے تھے اور مسلمانوں کو بظاہر یہی یقین دلاتے تھے کہ میری نبوت آنحضرت ﷺ کی نبوت سے الگ کوئی شے نہیں ہے اور میں مغض ان کا ایک خادم ہوں۔ وہ تو کثرتِ اطاعت و خدمت کا تقاضا ہے کہ از راہِ مجاز و ظل مجھے نبوت کے اعزاز سے نواز اگیا ہے ورنہ میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا۔ لیکن جب ذرا مزے میں آتے تھے تب اس جھوول کو یوں پورا کرتے تھے کہ ”ماساواں کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر اور نبی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب الشریعت ہو گیا۔ پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نبی بھی،“ (رسالہ الربيعیں 4، صفحہ 6-7)

جہاں تک تنقیح کی اس شق کا تعلق ہے کہ نبوت صرف ایک طرح کا اعزاز ہے یا اس کے سامنے کوئی نصب اعین بھی ہے جواب بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں یہی چاہتی ہیں کہ اس کا کوئی فعل بھی بے معنی اور بے کارنہ ہو۔ قرآن حکیم میں متعدد انبیاء علیہم کا تذکرہ آیا ہے اس میں ان کی ان خدمات جلیلہ کا تفصیل سے ذکر ہے جو انہوں نے انجام دیں اس لئے اس پہلو پر بحث بے فائدہ ہے۔

زندگی متحرک ہے

جو چیز غور و فکر کی محتاج اور بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ آیا انسانی معاشرہ ہر لمحہ تغیر

پذیر ہے یا کہیں کسی منزل پر تکمیل و اتمام کے تقاضوں کے سامنے اس کی روائی گاڑی رکتی بھی ہے؟ حکماء مغرب کا ایک گروہ انسانی معاشرہ کو بھی بجائے خود اسی طرح نامی، ہے اور ہر آن ارتقاء پسند سمجھتا ہے جس طرح کائنات کے دوسرے ظہورات، برگسان کا قول ہے کہ انسانی معاشرہ زندگی کے نئے نئے میدانوں میں خیمه گاڑھتا رہتا ہے اور یہ واقعہ ہے حقیقت اس سے زیادہ ایک حرفاً نہیں کہ وہ تعبیر ہے، ایک طرح کی حرکت سے جس کی کمیں اور منزل پہلے سے متعین ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور بڑے بڑے فلسفی صرف اتنا کرتے ہیں کہ اپنے پیغام و عمل سے اس معاشرہ کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان را ہوں پر اسے ڈالتے ہیں جو آسانی سے منزل تک پہنچانے میں مدد و معاون ہوں۔ نشوونما کی صلاحیتوں پہلے سے معاشرہ میں موجود ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام اور حکماء و قائدین کی کوششوں سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ان صلاحیتوں میں ایک طرح کی زندگی و تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور انسانی معاشرہ اس لائق ہو جاتا ہے کہ اپنے سفر کو خوش اسلوبی سے جاری رکھ سکے اور آگے بڑھ سکے۔

صحیفہ آدم کا حجم

زندگی سے متعلق یہ نظریہ ارتقاء صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ صحیح اس حد تک ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی بلاشبہ بالکل سادہ خانوں سے شروع ہوئی۔ چنانچہ ابوالبشر حضرت آدم کو جو پہلے انسان اور پہلے پیغمبر ہیں جو کتاب ہدیٰ دی گئی۔ اس کا حجم دو سطروں سے زائد پھیلاو کا نہیں ایک سطر میں اللہ کی توحید کے ساتھ ساتھ ان کے گرد و پیش کا تعارف مرقوم ہے۔

وَ عَلِمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرة: ۱۳) ”اور آدم کو سب چیزوں کے نام

باتے، اور دوسرا سطر میں لکھا ہے۔

وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرة: ٢٥) ”اور دیکھو اس درخت کے قریب نہ جانا۔“ پھر جس رفتار سے زندگی کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، احکام بھی اسی نسبت سے پھیلنے لگے۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے ہمیں انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں برابر ایک طرح کی تدریج و ارتقاء کا سراغ ملتا ہے اور محسوس طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر لاحق نے اپنے سابق سے معاشرہ کی دولت کو جس حال میں پایا ہے اس میں کچھ اضافہ ہی کیا ہے یا یوں کہے کہ معاشرہ کی رفتار کو صحیح سمتوں پر ڈالنے کے علاوہ آگے بھی بڑھایا ہے۔

قرآن حکیم چونکہ ایک اصولی کتاب ہے اس لئے اس میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کا حال ضمناً ہی آیا ہے اگر حقیقت کا ثہیک ثہیک مشاہدہ کرنا ہو کہ شریعت و احکام کا آغاز کیونکر سادگی سے ہوا اور پھر کس طرح اس کا معاملہ آہستہ آہستہ پیچیدہ ہوتا گیا اور پھیلتا گیا تو اس کے لئے بائیبل کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہاں آپ کو معاشرہ واقعی ایک رفتار سے چلتا ہوا اور ایک خاص رخ کی طرف بڑھتا ہوا معلوم ہو گا۔ یعنی یہاں آپ اس کی چال اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے اور معلوم کر سکیں گے کہ شریعت و آئین میں کیونکر اور کب ناگزیر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اشیاء کے مطالعہ نے بھی ہمارے سامنے قوموں کے ابتدائی کلچر کو بڑی حد تک اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں انسان کی ترقی کی کون کون منزليں طے کیں اور اس کی زندگی کے ڈھنگ میں کیا کیا تغیرات رونما ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ ارتقاء کی یہ گاڑی کبھی بخط مستقيم آگے نہیں بڑھی بلکہ با اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ فکر و عمل کی ایک ہی لغزش نے انہیں صد یوں پیچھے پھینک دیا۔ پھر اس کی راہ

میں موڑ انحراف اور بے شمار رکاوٹیں بھی آئی ہیں لیکن جہاں تک رشد و ہدایت کا تعلق ہے اس کے تقاضوں نے کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ﷺ آتے رہے۔ اس نے بحیثیت مجموعی یہ کہنا درست ہے کہ معاشرہ برابر حرکت پذیر ہا اور آئین و شریعت کے اعتبار سے زندگی کے چوکٹھے بدلتے رہے۔

زندگی متحرک تو ہے لیکن اس کی ایک منزل بھی ہے

غلط اس نقطہ نگاہ سے ہے کہ یہ رفتار قیامت تک اس نجی سے جاری رہے گی اور عقائد و عمل کی دنیا میں سچائیوں اور صدقتوں کا وزن متغیر ہوتا رہے گا۔ اس خیال کی تہہ میں ایک طرح کا ذہنی مغالطہ نہیں ہے، ذہن کی عادت یہ ہے کہ یہ جب ایک چیز کو ایک سے زائد بار ایک ہی ڈھنگ پر ظاہر ہوتے دیکھتا ہے تو اس سے منوس ہو جاتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ یہ اسی طرح ہمیشہ ظاہر ہوتی رہے اور پھر اس سے آگے بڑھا کر آخرا کاری حکم لگادیتا ہے کہ یہ اسی طرح ہو گا۔ مادہ کی تقسیم پذیری کے مسئلہ میں یونانیوں کو یہی دھوکا ہوا یعنی جب ذہن نے دیکھا کہ ہر چیز تقسیم ہونے اور مختلف اجزاء میں بٹ جانے کے بعد بھی مزید تقسیم کی متحمل رہتی ہے تو اس سے اندازہ ہوا کہ تقسیم و تجزیہ کا یہ فعل کبھی ختم نہ ہو گا اور مادہ کا ہر ہر جز برابر تقسیم ہوتا چلا جائے گا۔ حالانکہ یہ بد اہم غلط ہے۔ ایک کشتی چلتی ہے ایک جہاز سمندر میں تیرتا ہے ایک تیر فضا میں چھوڑا جاتا ہے۔ ذہن کا یہ قیاس صحیح ہوتا پھر کشتی کو کبھی ساحل تک نہیں پہنچا چاہئے۔ جہاز کو کہیں بھی لنگر انداز نہیں ہونا چاہئے اور تیر کو کبھی ہدف تک نہیں پہنچا چاہئے۔ اجرائے نبوت کے باب میں بھی ذہن نے یونہی سوچا۔ یاد رہے کہ نبوت و رسالت اللہ تعالیٰ کا ایک فیض ایسا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی رہنمائی کی

— ہزارائیت نے زاویوں سے

جائے اور اسے ایسی راہوں پر ڈالا جائے جو اسے منزل تک پہنچا دیں۔ قوموں کی زندگی میں ایسا مقام ہزاروں اور لاکھوں سالوں کے بعد بہر آئینہ ضرور آتا ہے جب یہ راہیں منزل تک جاتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہیں۔ مزید براں انسانی زندگی کے مسائل ایسے ہیں جو تغیر و ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے آخر کار اس مرحلہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں اختلاف و تنوع کی رنگارنگی ختم ہو جاتی ہے اور مسئلہ کے تمام پہلویاضمرات نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

ایک تمثیل

انسانی زندگی کی مثال ایک درخت کی طرح ہے جو پہلی منزل میں صرف ایک شاخ ہے، ایک دائیہ ہے، جسے دیکھ کر اس کے اندر کے مضمرات کا کوئی اندازہ نہیں لگاسکتا۔ پھر جب اس کو زمین میں ڈالا جاتا ہے تو اس میں نشوونما کی صلاحیتیں بیدار ہونا شروع ہوتی ہیں۔ ابتداء میں صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک سوئی سی زمین کا سینہ چیر کر نکلتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ نہیں نہیں کونپلوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ پھر پیتاں بنتی ہیں، رنگب و روپ نکھرتا ہے اور قد بڑھتا ہے تا آنکہ ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ شاخ کے تمام مضمرات پوری طرح ظاہر ہو جاتے ہیں اور آپ پکارا ہٹتے ہیں کہاب یہ پورا پورا پیڑ ہے یہ آم ہے، یہ کھجور ہے، بلاشبہ اس کے بعد بھی اس میں تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ تغیرات بالکل جزوی ہوتے ہیں ان سے درخت کی اصلی فطرت متاثر نہیں ہوتی۔ یعنی آم وہی آم، ہی رہتا ہے اور کھجور کے مزانج و خصوصیات میں بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔

ٹھیک اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے کہ حضرت آدم سے اس کا

آغاز ہوا پھر ہر ہر دور میں اس کے خدوخال ایک خاص نقشے اور روپ میں ڈھلتے چلے گئے اور پھر ایک ایسی منزل آگئی جب دیکھنے والوں نے کہا کہ اب تہذیب و شفاقت اور اخلاق و سیاست نے تغیر و ترقی کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ جگہ پائی ہے جہاں فی الحقیقت پہنچنا مقصود تھا یہاں پہنچ کر یہ گاڑی بیقیناً رکنا چاہئے کیونکہ اس سے آگے کوئی نیا اور بڑا اٹیشن ہی نہیں۔ جن جن اجتماعی الجھنوں سے ہمیں دوچار ہونا تھا ان سے دوچار ہو چکے اور جوئی الجھنیں پیش آ سکتی ہیں ان کا اندازہ ہے اس لئے اب کسی نبوت کا انتظار نہیں جو صورت حال میں ایسا تغیر پیدا کر دے جو خلاف توقع ہو، ہدایت و صداقت کے تقاضے مکمل ہو چکے اور گمراہیاں بھی انتہاء کو پہنچ چکیں۔ یعنی وہ تمام فتنے جو ابھر سکتے تھے ابھر چکے اور تمام برا بیاں رانج ہو چکیں۔ اس پر بھی اسلام کی جامعیت و اکملیت کا یہ حال ہے کہ کہیں اس نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا اور کسی مقام پر بھی اس کی شان ختمیت میں فرق نہیں آیا۔

دنیا کا پہلا آفاقی مذہب

اسلام کے مرتبہ ختمیت و اکملیت کا اندازہ خصوصیت سے دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک تاریخ کے اس موز سے جس میں یہ جلوہ طرازِ عالم و علمیاں ہوا اور دوسرے مسائل کی اس فیصلہ کن نوعیت اور ڈھنگ سے جو صرف اسی کا حصہ ہے اس کے پیغام کی ایک جانی بوجھی خصوصیت آفاقیت ہے۔ یہ دنیا کا پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے گروہ اور شعب کے حدود سے آگے بڑھ کر نفس انسانیت کو اپنا مخاطب نہیں رکھا جس نے تمام جغرافیائی حد بندیوں کا انکار کیا۔ نسلی و قبائلی حصاروں کو توڑا اور رنگ و بو کے اختلافات سے قطع نظر کر کے پورے انسانی معاشرہ کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔

یعنی اسلام دنیا کا پہلا عملی مذہب ہے جس میں مقام وزبان کی جگہ بندیوں کو ختم کیا گیا اور جو ایسی دینی قدرتوں پر اپنے عقیدہ کی بنیاد رکھتا ہے جو غیر مقامی اور ابدی ہیں۔ اس آفاقت کیلئے عیسائیت کی بدولت را ہیں ہموار ہو چکی تھیں، پلوں کی تبلیغی کوششوں سے رو میوں میں ایک بڑی تعداد غیر مختونوں یا انجلیوں کی اصطلاح میں غیر قوموں کی تیار ہو گئی تھی جن کے دلوں میں عیسائیت کے لئے خاصی تڑپ تھی اور قسططین اعظم کے عیسائی ہو جانے سے تو گویا عیسائیت کی حیثیت سرکاری مذہب ہی کی ہو گئی تھی اس لئے یورپ میں اسے پاؤں پسارنے کا خوب موقع ملا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی برکت سے ان مغربی قوموں کی فطری حوصلہ مندی بروئے کار آئی اور یہ یوں فاتحانہ طور پر یورپ واشیشا کی مختلف قوموں کو جو صدیوں سے جدا جدا رہتی تھیں ملادینے میں کامیاب ہوئی اور اس طرح یہ تو ہوا کہ انسانیت چھوٹے چھوٹے قومیت کے دائروں سے نکل کر ایک بڑے دائے میں داخل ہوتی اور آفاقت و عالمگیریت کی طرف ابتدائی قدم اٹھا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ عیسائیت کے پاس ایسی کوئی عالمی دعوت نہیں تھی جس پر پوری انسانیت کی شیرازہ بندی ہو سکتی۔ عمل کا کوئی چوکھتا نہیں تھا جو مختلف قوموں اور ملکوں کی رنگارنگی کے باوجود بکار آمد ہوتا اور نگ و نسل کے اختلاف کے علی الرغم انسانیت کیلئے ایسی اوپنجی اخلاقی و معاشرتی سطحیں مہیا کرتا جہاں سب فرقے مٹ جاتے اور اخوت و بھائی چارہ کی بنیاد پڑتی۔ لہذا اس کی فتوحات عملاً صرف اتنا ہی کر سکیں کہ انسانی معاشرہ کوتاری کے ایسے موڑ پر لا کر چھوڑ دے، جہاں اجتماعیت بیدار ہو اور آفاقت کروٹ لے، اب یہ کام اسلام کا تھا کہ اس میں افادیت و تکمیل کا رنگ بھردے۔

اسلام سے پہلے

تاریخ کی اس مناسبت پر جس سے اسلام آخری مذہب قرار پاتا ہے ایک اور اعتبار سے بھی غور ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ اس سے قبل کے مذاہب پر ایک تنقیدی نظرڈال کر دیکھیں کہ انہوں نے رشد و ہدایت کے تقاضوں کو کس حد تک تشنہ چھوڑا۔ مثلاً یہودیت کو لیجھے جن لوگوں نے اس کے مطالعہ میں تھوڑی سی بھی رحمت گوارا کی ہے وہ جانتے ہیں کہ صدیوں کے تغیر و تبدل کے بعد اس میں جو ہونا ک عیب پیدا ہو گیا تھا وہ مذہب کے باب میں ان کی وہ تنگ نظری تھی جس کی وجہ سے زندگی کا پھیلاو سمت کر چند مسائل میں محدود ہو کرہ گیا تھا اور پھر اس پر مسترا دی یہ کہ یہودی ان مسائل کے معاملہ میں بھی مختص نہیں تھے۔ صرف الفاظ اور ظواہر کی حد تک پابندی کے قائل تھے۔ مذہب سے ان کی دلچسپی صرف اتنی ہی تھی کہ اس میں چند مسائل ہیں، چند احکام اور رسوم ہیں جن کی ٹھیک ٹھیک تعین اور وضاحت ہونا چاہئے۔ عمل ضروری نہیں چنانچہ قرآن حکیم نے ان کی اسی کمزوری کی طرف اس مشہور واقعہ میں اشارہ کیا ہے کہ جب انہیں ایک قتل کے سلسلہ میں گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے اس پر بڑی جرح کی۔ قانون اور ضابطے کی رعایت سے میں مخ نکالی اور بظاہر ذبح کرنے پر مجبور بھی ہو گئے۔ لیکن دلوں کی حالت یہ تھی کہ وہ اس کے لئے قطعی آمادہ نہیں تھے۔

فَذَبَحُوا هَاوَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۝ (البقرة: ۷۱)

”اس پر انہوں نے گائے ذبح تو کرڈا لیکن وہ ایسا کرنے کے نہیں تھے۔“

دین کے اس جزوی تصور اور کھوکھ لفظی لگاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے خیال

کیلئے فضاء ہموار ہوئی۔

عیسائیت کیونکر پیدا ہوئی

اور وہ یہ تھا کہ شریعت کی پابندی ہی انسان کے لئے غیر فطری ہے یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے جی چراتا اور پہلو تھی کرتا ہے۔ اس لئے دین کا تصور ہی ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں سونا گزر یا اخلاقی پابندیوں کے اور کوئی شرعی و دینی پابندی نہ ہو، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ عیسائیت آگے بڑھتی ہے اور پولوس اس اصول کو بنیادی عقیدے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یعنی صاف صاف کہتا ہے کہ شریعت معاذ اللہ لعنت ہے اور مدارِ نجات عمل نہیں بلکہ عقیدہ اور ایمان ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ یہود کی فقیہا نہ بدکاری ختم ہو گئی لیکن ایمان و عقیدہ کی روک اتنی مضبوط ثابت نہ ہوئی جو فتن و فجور کی بولمنیوں پر قابو پاسکے لہذا تاریخی طور پر ضرورت محسوس ہوئی کہ اب مذہب کا جامع اور آخری تصورِ رہنمائی کیلئے آگے بڑھے جو شریعت و ایمان کے حدود کو متعین کر سکے۔ جو عقیدہ و عمل میں ٹھیک ٹھیک گردگاہ سکے اور یہ بتا سکے کہ ایمان زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں اور زندگی کا تصور اس ڈھنگ سے پیش کر سکے کہ گویا وہ اس درجہ فطری اور ضروری ہے کہ اس سے اغماض نفسِ زندگی کے اغماض کے مترادف ہے۔ عیسائیت و یہودیت کے اس بگڑے ہوئے تصور نے مذہب کو جس روپ میں پیش کیا اس کا قطعی طور پر تقاضا تھا کہ انسان کو اب زیادہ پریشان نہ کیا جائے اور اسلام اپنی آخری و متوازن تعلیمات کے ساتھ رہنمائی کی باغ ڈورا پنے ہاتھ میں لے لے۔

مسائل کا فیصلہ کن انداز

مسائل کے باب میں بھی اسلام نے جو فیصلہ کن انداز اختیار کیا ہے اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہی دین خدا کا آخری اور مکمل دین ہے اور یہ حقیقت اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ جن لوگوں نے بحث کے اس پہلو پر غور کیا ہے وہ اکثر مناظرانہ قیل و قال سے بے نیاز ہو گئے ہیں یعنی اگر قرآن حکیم میں ختم نبوت سے متعلق کوئی تصریح نہ کوئی نہ ہو تکمیل دین کا کوئی مژده اس میں نہ ہو تو تب بھی یہ دین اپنی جگہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ پہلی نظر سے اس کی جامعیت و اکملیت کا یقین ہو جاتا ہے۔ آپ ہی بتائیے عقائد میں توحید سے آگے انسانی تصور کے لئے پرواز کی کوئی گنجائش ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جس ڈھب سے اپنی صفات پیش کی ہیں ان سے زیادہ بہتر انداز انسانی سمجھ بوجھ اختیار کر سکتی ہے؟ عبادات میں نماز سے زیادہ کامل، زیادہ جامع اور زیادہ روحانیت آفریں نقشہ ہمارے ذہن میں آتا ہے؟ معاشرتی زندگی میں مرد اور عورت کے حقوق کی تعین جس توازن سے اسلام نے فرمائی ہے اس میں کسی اصلاح و ترمیم کے لئے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟ سرمایہ اور رحمت کے مسئلہ کو جس خوبی سے حل فرمایا ہے انسانیت کے بڑے سے بڑے حامیوں کو بھی اس سے بہتر حل سو جھا ہے؟ یعنی زندگی کے پورے چوکھے کو اسلام نے جس طرح سجا�ا ہے اس کی زیب زینت پکار پکار کر اس کی تکمیل و اتمام پر گواہی دے رہی ہے۔

تکمیل کے معنی

اس فصل کے اختتام سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ تکمیل دین سے اسلام کا منشاء کیا ہے۔ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اسلام معاشرہ انسانی کے تسلیل و ارتقاء کے بارے میں مایوس ہے۔ یعنی اس کا خیال ہے کہ آئندہ اس میں کوئی تغیر رونما ہونے کا نہیں حالانکہ سائنس کی ترقیات صبح و شام اس تصور کی تردید کر رہی

ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تغیرات تو ہوتے رہیں گے۔ معاشرہ انسانی آگے بھی بڑھے گا مگر اس میں بنیادی تبدیلیاں رونما نہ ہوں گی۔ سائنس کی ترقیات سے صرف اتنا ہو جائے گا کہ جزئیات کی نئی نئی شکلیں ہمارے سامنے آئیں۔ اقتصاد و سیاست کی نئی نئی جزوی ابجھنیں پیدا ہوں جو ہمارے معاشرتی چوکھٹے کو فی الجملہ متاثر کریں۔ ایسا یقیناً ہوتا رہے گا اور ایسا ہونا قطعی اسلام کے حق میں مضر نہیں۔ اسلام کی پوزیشن یہ ہے کہ یہ مکمل ہونے کے باوجود اپنے اندر اجتہادی لپک بھی رکھتا ہے اس لئے اس طرح کی صورتحال سے عہدہ برا ہونا کچھ بھی دشوار نہیں۔

دوسرامحاذ

ختم نبوت کے متعلق ایک محاذ تو ان لوگوں کا تھا جو کھلے بندوں آنحضرت ﷺ کے بعد اجرائے نبوت کے قائل تھے ان سے متعلق ہمیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ ایک دوسرا محاذ ہے جن سے نہ نہنا آسان نہیں کیونکہ یہ لوگ ظاہر ختم نبوت کے قائل ہیں لیکن عقیدہ و عمل کے اعتبار سے ان میں اور دوسرے گروہ میں ہمیں غور و فکر کے بعد بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اس اجمال کی تفصیل معلوم کرنا ہو تو حضرات تشیع کا جو عقیدہ آئمہ اطہار سے متعلق ہے اس پر غور فرمائیے۔ اس سلسلہ کی پہلی بات جس سے نبوت و امامت کے ڈائلے ملے ہوئے محسوس ہوئے ہیں یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اس بات کا مقتضی ہے کہ انسانی ہدایت کیلئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھیجے اسی ڈھنگ کا ایک سلسلہ امامت کا ہے جسے حفظِ دین کی خاطر مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا جاری رکھنا بھی اس کے لطف و کرم کیلئے اتنا ہی ضروری ہے۔ پھر جس طرح پیغمبر مصوم ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی واجبات سے ہے کہ امام بھی

معصوم ہو۔ علامہ حلی نے اس پر پانچ دلائل پیش کئے ہیں:-

(1) امامت کی ضرورت یوں محسوس ہوتی ہے کہ عوام ہمیشہ لغزش و خطاء کے مرتكب ہو سکتے ہیں۔ لہذا ایک شخصیت ایسی ہونا چاہئے جو نگران ہو، اب اگر یہ شخصیت بھی غلطی کر سکتی ہے تو اس کی ضرورت ہی نہ ہی۔

(2) امام محافظہ شرح ہے اس لئے اس کے حق میں عصمت کا ہونا شرائط اولیہ سے ہے۔

(3) اگر امام سے غلطی کا امکان ہو تو اس غلطی پر اسے ٹوکنا اور متنبہ کرنا جائز ہو گا حالانکہ اس کی اطاعت ضروری ہے۔

(4) اگر اس سے غلطی کا صدور ہو تو وہ غرض ہی فوت ہو جاتی ہے جس کے لئے اس کے نصب کو ضروری تھہراایا گیا ہے۔

(5) اس غلطی کے ارتکاب کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا مرتبہ عوام سے بھی کم درجہ کا ہے کیونکہ اس کی عقلی صلاحیتیں عوام سے بہرآئینہ زیادہ ہوتی ہیں۔ تعلق بالله اور معرفتِ الہی کے نقطہ نظر سے بھی اس کا مقام اوپر ہے۔

اس پر بھی اگر یہ غلطی کر سکتا ہے تو عوام اس سے اچھے رہے کہ کم صلاحیتوں کے باوجود غلطیوں سے بچ رہے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ ان دلائل کی منطقی حیثیت کیا ہے اور کیونکہ علامہ حلی نے ایک سنجیدہ دینی عقیدے کی بنیاد خطابیات پر رکھی ہے سر دست اس پر غور فرمائیے کہ امام کا حضرات امامیہ کے نزدیک معصوم ہونا ضروری ہے۔ حقیقت غور طلب یہ ہے کہ معصوم امام مفترض الطاعة بھی ہوتا ہے۔ اب اگر تین باتوں کو باہم ملائیے گا تو نتیجہ میں جو شے سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ بیوت کے ساتھ ساتھ حضرات شیعہ کے نزدیک ایک بالکل متوازی نظام امامت کا بھی جاری ہے یعنی جس طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ

والسلام کی بعثت ضروری ہے اسی طرح آئمہ کا نصب ضروری ہے۔ جس طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام فکر و عمل کے اعتبار سے معصوم ہوتے ہیں اسی طرح آئمہ اطہار کا دامن ہر طرح کی ذہنی و عملی لغزش سے پاک ہوتا ہے۔ پھر جس طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ماننا ان پر ایمان لانا اور ان کے فیصلوں کے سامنے اطاعت کے لئے گردن جھکانا فرض ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ حضرات آئمہ کی اطاعت کی جائے اور ان کے فیصلوں کے سامنے سر جھکایا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ نبوت اور امامت میں بعض صفات کی کمی بیشی مابہ الامتیاز ہو مگر جہاں تک نبوت کے اس تصور کا تعلق ہے جو ہر آدمی کی سمجھ میں آ سکتا ہے اس کے یہ تین ہی بڑے بڑے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ بعثت و نصب کا وجوب، عصمت کا ہونا اور اطاعت و انقیاد کی فرضیت، یعنی اللہ نے اسے بھیجا ہو، عملی زندگی پاک اور نبوٰنے کی ہو اور اس کی اطاعت انسان پر فرض ہو اور ان تینوں باتوں میں امامت و نبوت میں اشتراک ہے۔ اب اگر ایک گروہ یہ مانتا ہے کہ ختم نبوت سے صرف اتنا ہی ہو پایا ہے کہ لفظ نبوت کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر نہیں ہو سکے گا لیکن آنحضرت ﷺ کے بعد ایک دوسرے نام سے رشد و ہدایت کا یہی سلسلہ جاری رہے گا اور اس کا ماننا اور تسلیم کرنا ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہو جتنا سلسلہ نبوت کا، تو واقعہ عمل کے اعتبار سے اجرائے نبوت اور اجرائے امامت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص تو حید کے یہ معنی لیتا ہے کہ کسی شخص پر لفظ اللہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا کسی کورب اور پروردگار نہیں کہہ سکتے لیکن عملاً ایسے مرکزوں سے اس کی عقیدت و محبت برابر وابستہ ہے جو اختیارات کے اعتبار سے کسی طرح بھی اللہ سے کم نہیں تو کیا آپ اسے تو حید ہی قرار دیں گے اور شرک نہیں سمجھیں گے۔ جس طرح توحید کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ غیر اللہ کے

سامنے جھکنا تو جائز نہیں لیکن سجدہ کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھا جائے اور ضروریات اور مشکلات کے وقت اس کو پکارنے اور اس سے استمد ادواعانت چاہئے میں بھی کوئی گناہ نہ متصور ہو، صرف اتنی احتیاط البتہ ملحوظ خاطر رہے کہ اس غیراللہ کو اللہ کے نام سے متصف نہ کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح سے ختم نبوت کے معنی ہرگز نہیں ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی اطاعت و انقیاد کے چور دروازے کھلے ہیں۔ یعنی اب بھی انسان مجبور ہے کہ مستقلًا ایک سلسلہ رشد و بدایت مانے اور اپنی عقیدت و محبت کا اسے مدار اور محور قرار دے۔ ہاں ختم نبوت کے اعتراض سے بچنے کے لئے اس نوع کے سلسلہ کو جو باعتبارِ واقعہ قطعی نبوت کے مترادف ہے۔ نبوت کا سلسلہ نہ تھہرانے بلکہ اس پر امامت کی چھاپ لگائے۔

اماًت و نبوت میں جو فرق حضرات شیعہ کے یہاں ہے وہ نام اور چھاپ کا تو ضرور ہے حقیقت و معنی کا ہرگز نہیں۔ اس کے بر عکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت ایک ایجادی حقیقت کا نام ہے اور ایک ثابت معنی سے تعبیر ہے وہ حقیقت و معنی سوا اطاعتِ مفروضہ اور بلا شرط و انقیاد کے اور کوئی چیز نہیں۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت خاتم النبیین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی اطاعت ہم پر فرض ہو، جس کا مانا ضروری ہو اور جو ہمارے لئے اسوہ و نمونہ قرار پاسکے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کیلئے اطاعت و عقیدت کا ایک مرکز ہمارے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بجز آنحضرت ﷺ کی اطاعت و انقیاد کے اور تمام دروازوں کو امت محمدیہ ﷺ پر بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی نبوت کے جن کوازوں کو بند کیا

گیا ہے وہ صرف نام اور چھاپ کے کواٹنیس، حقیقت و معنی کے کواٹ ہیں۔
کوئی انسان معصوم نہیں ہو سکتا

اسلامی نقطہ نظر سے بجز انبیاء علیہم السلام کے ہر ہر شخص گناہ و معصیت کی دلآدیزیوں پر تباہ سکتا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ اسے عقل و خرد کی جو حقیر پونجی دی گئی ہے وہ گناہوں سے نمبر دا زما ہونے کی صلاحیتوں سے یک قلم محروم ہے اور کچھ اس لئے کہ الہام و دھی کی روشنی کے بغیر خود عقل نامکمل اور ناقص ہے۔ نفیات کے جدید ترین اکتشافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان اپنے اعمال اور زندگی کے ظہورات میں اتنا معقول پسند نہیں ہے جتنا کہ نفس کی تحریکات کے مقابلہ میں مجبور ہے۔ یعنی یہ جو چار دنگِ عالم میں اس کی منطق آرائی اور فلسفہ دانی کے ڈھنڈوڑے پڑ رہے تھے۔ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ خارجی دنیا میں اس کے اقتدار و سطوت کا چاہے کتنا چرچا ہو اور وہ صحیح بھی ہو۔ باطن کی ابھری ہوئی اور فعال خواہشات سے عہدہ برآ ہونے کی تو اس میں مطلق سکت نہیں کیونکہ عقل و خرد کا مزاج ہی ایسا ہے کہ یہ اپنے اندر فعال رہنمائی کی صلاحیتیں بالکل نہیں رکھتی۔ اس کے کام کا ڈھنگ اس طرح کا ہے کہ یہ تعریض نہیں کرتی اور آخر میں تو ترغیبات کے مقابلہ یہ اتنی مغلوب ہو جاتی ہے کہ اس کا کام فقیر شہری کی طرح صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جب ایک برائی ہو چکے تو یہ اس پر جواز کی مہر ثبت کر دے۔ البتہ نبوت کی عقل ایسی ہوتی ہے جس میں خانیت کی جھلک ہے اور جو گناہوں سے نہیں کی پوری پوری صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ربویت کو یہ منظور ہے کہ کائنات انسانی کیلئے کچھ اسوہ و نمونہ کی روشن سطحیں کروٹ نہ لیں اور پھر اس عقلِ فعال و پاک میں

بھی بشریت کی اتنی رعایت موجود ہے کہ اجتہاد و فکر کی لغزشوں کا برابر امکان موجود ہے۔ و نسی ادم اول الناس اول ناس الہذا کسی انسان کو جب اس کا مزاج بشری یہی ہے، مخصوص ٹھہرانا قطعی غیر عقلی اور غیر اسلامی ہے۔ انہیاء علیہم السلام کے باب میں عصمت کا مانا تو اس لئے درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ انہیں فکر و عمل کی کسی لغزش پر قائم نہ رہنے دیا جائے لیکن آئندہ کے باب میں اس ڈھنگ کے اہتمام کا کہیں ذکر نہیں۔

مذہب کا مطالبہ

انسانی فطرت کی اسی کمزوری کے پیش نظر کہ یہ ترغیبات نفس کا آسانی سے شکار ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں کے معاملہ میں کلی احتراز کا مکلف نہیں گردانا، یعنی اس سے مذہب کا مطالبہ نہیں ہے کہ اس سے کبھی گناہ کا صدور نہ ہو یا کبھی اس کے ذہن و فکر میں لغزش کروٹ نہ لے بلکہ صرف اور صرف اس قدر ہے کہ یہ حتیٰ المقدور پاکبازی و نیکی کے معیاروں کو قائم رکھنے کی سعی کرے اور اس پر بھی اگر گناہ و معصیت کی جاذبیتیں اسے بہکا ہی دیں تو فوراً متنبہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے آگے بخشش کے لئے دعا و طلب کے ہاتھ پھیلا دے۔

وَإِمَّا يُنْزَغَنَكَ مِنَ الشَّيْطَنِ نَرُعْ فَاسْتَعِدْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

(الانفال : ۲۰۰)

”اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی تحریک تمہیں محسوس ہو تو اللہ سے پناہ مانگو وہ یقیناً سننے والا اور تمہاری فطری کمزوریوں کو جانے والا ہے۔“

عصمت آئمہ کا عقیدہ کیونکر پیدا ہوا

ان حالات میں عصمت آئمہ کا عقیدہ حضرات شیعہ میں کیونکر پیدا ہوا جبکہ اس کے لئے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ میں کوئی نص موجود نہیں اور جب کہ یہ عقیدہ خلافِ عقل بھی ہے۔ اس کا جواب معلوم کرنے کیلئے اولاً اس تاریخی پچھواڑ اور بیک گرا و نہ پر غور کرنا چاہئے جس نے اس عقیدہ کیلئے راہیں ہموار کیں۔ یہ ظاہر ہے خلافتِ راشدہ تک شیعی اختلاف کی نوعیت غیر سیاسی تھی۔ حضرت علیؑ دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ بر بنائے قرابت داری، خلافت کا حق آنحضرت ﷺ کے بعد انہی کو پہنچتا ہے جبکہ دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا مزاج شورائی ہے۔ وَشَاءُرُهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۰۹) ”اوہ آپ ﷺ معمالات میں مشورہ کر لیا کیجئے۔“

اس لئے خلیفہ وہ قرار پائے گا جس پر صحابہ ﷺ کی معتقد بہ جماعت جمع ہوگی۔ حضرت علیؑ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ محض ایک تعبیر ہے اور اس کی دوسری تعبیر وہ ہے جو ان کے علاوہ جلیل القدر صحابہ ﷺ نے اختیار کی۔ حضرت علیؑ کے بعد بنی امیہ کے دور میں اس سیاسی اختلاف نے بالکل دوسرا ڈھنگ اختیار کیا۔ اب تک روزمرہ کی عملی زندگی پر اس اختلاف کی کوئی پرچھائیں نہ پڑی تھیں۔ چنانچہ حضرت علیؑ اور ان کے اتباع اسی انداز سے نمازیں پڑھتے تھے جس طرح دوسرے صحابہ ﷺ کی طرح روزے رکھتے تھے جس طرح دیگر صحابہ ﷺ پعنی زندگی کے تمام ظہورات میں ان کا اسلام عامۃ المسلمين کے اسلام سے کسی طرح مختلف نہیں تھا مگر جب یہ تلخیاں بنو امیہ کی بیہودگیوں کی وجہ سے بہت

زیادہ بڑھیں تو شیعیت میں بھی رعمل کے طور پر شدید عصبیت پیدا ہوئی۔

شیعیت اسلام کے خلاف ایک سازش

تاریخ کے اس موڑ پر ایران کی مغلوب مجوہیت اور کچلی ہوئی یہودیت میں سازش ہوئی اور یہ طے کیا گیا کہ اسلام سے اس کے غلبہ و تفوق کا انتقام لینا اس طرح ممکن ہے کہ آپس کے اس اختلاف کو اپنایا جائے۔ اس میں اپنا مخصوص عقیدہ اور روح داخل کی جائے اور اس کو ایسی شکل میں ڈھالا جائے کہ بظاہر یہ اسلام کا ایک فرقہ ہی رہے مگر اسلام کی کوئی ادا اور اسلام کا کوئی حسن اس میں باقی نہ رہے۔ یعنی اس کے عقیدوں کے خور یک قلم بدل دیئے جائیں۔ اس میں اطاعت و محبت کی سمتیں بھی از سر نہ متعین ہوں اور ایک ایسا متوازنی نظام تجویز کیا جائے جو بتدریج اثرات و نتائج کے اعتبار سے اسلام کا حریف اور مدقابل ثابت ہو سکے۔

ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ یہ سازش کامیاب رہی، اسلامی تاریخ کا معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر جو جو آفتیں آئیں ان کی تہہ میں یہی تصور کا فرماتھا جس کو مجوہیت اور یہودیت نے پیدا کیا۔ اس سازشی گروہ کے سامنے دشواری یہ تھی کہ اگر یہ اسلام کے اسی ڈھانچے کو قائم رہنے دیتے ہیں جس کو آنحضرت ﷺ نے پیش کیا اور عقیدت و محبت کے دائروں کو نبوت تک محدود رکھتے ہیں اور ما تھوں کو دوسرے آستانوں پر نہیں جھکاتے تو اس سے یہ خدشہ لاحق ہے کہ مخالفت و عناد کی وہ فضائیگری ہے جس کی تلویں میں عمداً اضافہ کیا گیا اس لئے نبوت کے مقابلہ میں امامت کو لامحالہ لانا پڑا۔ آپ اگر شیعہ کتب و روایات کا مطالعہ کریں گے تو ایک چیز جو آپ کی توجہ کو اس طرف موڑے گی وہ یہ ہوگی کہ یہاں اللہ اور

— مراہیت نے زاویوں سے —

رسول ﷺ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو آئمہ کو ہے۔ یہاں فضائل و مناقب اور معجزات و رسالت کی کورکو بہرآئینہ دستی ہوئی نظر آئے گی اور یوں معلوم ہو گا کہ امام حسین علیہ السلام اور آئمہ اہل بیت علیہ السلام کے مقابلہ میں معاذ اللہ یہ دوسرے درجے پر ہیں۔ اسی لشیخ پر کا اثر ہے کہ ایک شیعہ نفیاتی طور پر مجبور ہے کہ وہ محبت و دائبگی اور لگاؤ اور تعلق خاطر کی ہر ہر کیفیت کو صرف آئمہ اہل بیت تک محصور رکھے اور اس حقیقت کو نہ سمجھے کہ اصل میں مقصود بالذات تو اسلام ہے اور یہ وہ کسوٹی اور معیار ہے جس کی نسبت سے فضائل و مناقب کی قدر یہ متعین ہوتی ہیں، یعنی اسلام میں اطاعت و عقیدت کے لئے ایک اصول متعین ہے جس کی رعایت بہرآئینہ ضروری ہے۔

فرقِ مراتب

یہ اصول فرقِ مراتب کا ہے اس میں جو شے محبت و عقیدت کے لائق ہے وہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات بے ہمتا ہے۔

وَالَّذِينَ أَمْنُوا أَشَدُ حُبَّاً لِّلَّهِ (البقرة: ۱۶۵)

”اور وہ لوگ جو مومن ہیں، وہ اللہ کو زیادہ چاہتے ہیں“ پھر دوسرے درجہ پر محبت و عقیدت کا محور آنحضرت ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے۔

قُلْ إِنَّ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاَتَبْعُونِي يُحِبِّكُمُ اللَّهُ (آل عمران: ۳۱)
”اے رسول کہہ دو کہ اگر تمہیں واقعی اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی اختیار کرو اس پر خود اللہ تمہیں چاہئے لگے گا“ تیسرا درجہ پر صحابہ علیہم السلام اور آئمہ اہل بیت ہیں جن میں پھر ایک ترتیب ہے۔

وَالسَّبِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوْهُمْ

بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (التوبہ : ۱۰۰)

”اور مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے سبقت کی اور وہ لوگ جوان کے بعد خلوص دل سے داخل ایمان ہوئے اللہ ان سے خوش اور وہ اللہ سے خوش“ غرضیکہ جب عصیت و سازش نے مل کر ایک نیاروپ دھارا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ عقیدت و محبت کی موجودہ سمتوں کو بدلنا جائے کیونکہ اگر محبتوں کے باب میں توازن اور فرقہ مراتب کا یہ انداز قائم رہتا ہے تو پھر یہ سازش کامیاب نہیں رہتی اور اس اختلاف کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں رہتی جو صحابہ سے ہے کیونکہ یہی تو دین کے حامل و سرچشمہ اور مبلغ ہیں، انہی کی وساطت سے دین تک پہنچا ہے۔

عصمت آئمہ کے عقیدے کو ماننے کی ضرورت یوں بھی محسوس ہوئی ہے کہ شیعہ حضرات چونکہ اصولاً ان ذرائع ہی کے قائل نہیں جن سے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہم تک منتقل ہوا۔ مزید برآں ان کے ہاں ہمیشہ سیاسی خلفشار میں رہنے کی وجہ سے کوئی سلسلہ روایت مرتب نہ ہو سکا جو آنحضرت ﷺ تک پھیلا ہوا ہو اور جس کی ایک ایک کڑی نقاد ان فن کے سامنے ہو۔ اس لئے مرویات کے اس نقش کو چھپانے اور جرح و نقد کے تیز کانٹوں سے بچنے کیلئے ”عصمت آئمہ“ کا ایک ”عقیدہ“ گھرا گیا تاکہ جب بات ان کی طرف منسوب ہو جائے تو اس پر کوئی رائے زنی نہ ہو سکے اور چپ چاپ سے مان ہی لیا جائے۔

ختم نبوت ایک مثبت عقیدہ

غرض جہاں تک ختم نبوت کے حدود کا تعلق ہے اس میں یہی چیز داخل نہیں کہ آپ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی نبوت کے قائل ہیں یا نہیں۔ یہ شے بھی داخل ہے

کہ عقیدت و محبت کے نئے نئے محور اب تلاش نہیں کئے جائیں گے اور قیامت تک کیلئے یہ کافی ہو گا کہ کتاب و سنت کی روشنی سے استفادہ کیا جائے۔ اب کسی کی ذات کا ماننا یا نہ ماننا کفر و اسلام اور ہدایت و گمراہی کا معیار نہ بن سکے گا اور کوئی شخص بھی اس موقف پر فائز نہیں ہو گا کہ اس کی وجہ سے ہدایت رہنمائی کی سمتیں بدل جائیں اور کوئی عصیت اور گروہ بندی جائز نہ ہو گی جس سے کہ کتاب و سنت کا مرتبہ ثانوی ہو جائے۔ ختم نبوت ایک ثابت اور ایجادی عقیدہ ہے اور ایک طرح کا پیرایہ بیان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی والہام کا وہ انداز جو اطاعت و تعبد کا مقتضی ہے تکمیل تک پہنچ چکا اور ہدایت کے تمام مضرات نکھر کر نگاہ اعتبار کے سامنے آ چکے۔ اب یہ کسی جماعت کیلئے روانہ نہیں کہ ان سے ہٹ کر عقیدت و محبت اور اطاعت و فرمانبرداری کے اور اور صنم خانے تعمیر کرے۔ اب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دینی اقدار کو معین کر دیا گیا اور واشگاٹ طور پر بتادیا گیا کہ توحید میں کن کن نزاکتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ عبادات کی کیا کیا شرائط اور تفصیلات ہیں۔ معاشرت اور تدبیر منزل کے کیا کیا اصول ہیں اور سیاسی و اقتصادی رجحانات کو کن کن سانچوں میں ڈھالنا چاہئے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو ہمیں بتایا جائے کہ اجرائے نبوت سے کیا مقصود ہے؟ اب اگر کوئی صاحب نبوت و عصمت کا البادہ اوڑھ کر جلوہ گر ہو، ہی جائیں تو ہمیں کن نئے مسائل کی تلقین کریں گے جن کو اب تک ہم نے نہیں سنائے کر جدید ھائق کی طرف توجہ دلائیں گے جن سے ہماری اپنی بصیرت آشنا نہیں ہوئی۔ اگر واقعہ یہ ہے کہ کوئی کیفیت منتظرہ باقی نہیں رہی اور اسلام نے ہر ہرشے کی پوری پوری وضاحت کر دی ہے تو دنیا و عقبی کی سعادتوں سے بہرہ مند ہونے کیلئے یہ کافی ہے۔

درachiل یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے اشکال کیا ہے؟ اشکال یہ نہیں کہ حضرت مسیح الطیب الطیب کی وفات ہو چکی یا وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں، اشکال یہ بھی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت کا کوئی امکان ہے یا نہیں، اشکال یہ ہے کہ اسلام نے جن اصولوں کی وضاحت کی ہے اور زندگی کی عملی گتھیوں کو جس انداز سے سمجھایا ہے اس وقت ان اصولوں کو کیونکر رنج کیا جائے اور اس انداز کو کس طرح اپنایا جائے۔

اگر نئی نبوت ہماری مشکلات کا حل ہوتی، یا عصمت آئندہ کا عقیدہ ہمیں ادبار و تسلیل کے دائروں سے نکال سکتا تو آج ہم یقیناً زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی سے تگ و تاز کر سکتے مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس ڈھنگ کے مزخرفات سے ہمیں نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اثاث انقصان پہنچا ہے۔ اس لئے آؤ! ان سب کو چھوڑ کر کتاب و سنت ہی کو آزمائیں اور اپنی توجہ کو دوسرا تمام سمتوں سے ہٹا کر اسی ایک سمت پر مرکوز کر دیں اور اس کے بعد بھی اگر ہم کامیابی سے ہمکنار نہ ہوں تو پھر بلاشبہ کسی نئی روشنی کی طرف دوڑنا اور کسی نئی حکمت کی پیرروی کرنا ہمارے لئے ضروری ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت بھی مرزا صاحب کاظمہ و رادعاء افسوس ہے کہ ناقابل التفات ہو گا کیونکہ ان کے وسیع و عریض لثر پنچر میں عمل و سعی کے تقاضوں کا کوئی جواب نہ کوئی نہیں۔ اس میں جو کچھ ہے اس کو ان تین لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ دعاویٰ پیش گویاں اور ان کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش اور بس۔

قادیانی الگ قوم

- کیا قادیانی الگ قوم ہیں؟
- تاویلات کے مختلف مدارج
- قوم کے کہتے ہیں؟
- جذبات کا اختلاف
- یہ مناظرانہ بیچ نہیں
- چوبہری ظفر اللہ کا عارضی اقتدار
- آئندہ دستور میں مرا زاویوں کی جگہ
- مسئلہ ختم نبوت اور اقلیت
- ذہب دریاست کے موجودہ تقاضے اور نبوت

فرقة... یا... اقلیت

کیا قادیانی ایک الگ قوم ہیں؟

(ایک علمی بحث)

فرقہ یا اقلیت

یہ مسئلہ خالص دستوری و آئینی ہے کہ قانونی چوکھے میں مرزا یوں کی کیا حیثیت ہو؟ انہیں مسلمانوں کا ایک گمراہ فرقہ، ایک برخود غلط شاخ اور جادہ حق و صداقت سے ہٹی ہوئی ایک جماعت قرار دیا جائے یا مستقل قوم، الگ مذہب اور مخصوص اقلیت سمجھا جائے؟

ختمنبوت کے ضمن میں ہم نے عرض کیا تھا کہ جہاں تک اسلامی نقط نظر کا تعلق ہے ختم نبوت بنیادی مسئلہ ہے اور اس میں قطعاً اتنی لچک نہیں ہے کہ مرزاً علم الكلام کی تاویلاتِ فاسدہ کا متحمل ہو سکے کیونکہ تاویلات کے لئے کچھ علمی شرائط ہیں، ادب و نحو کی پابندیاں ہیں اور اسلامی ذہن کے ساتھ سازگاری کی ایسی قیود ہیں جن کو اگر لمحوڑ رکھا جائے تو قادیانی تحریفات کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔

تاویلات کے مختلف مدارج

ہم نے اس تشقیح کو بھی واضح کیا تھا کہ ختم نبوت کے معاملہ میں قادیانی برتاوُ کو تاویل قرار دینا اس اعتبار سے تو صحیح ہے کہ اصطلاح میں بہرا آئینہ اسے تاویل ہی نہ ہرایا جائے گا لیکن اگر تاویل کے مختلف مدارج ہیں اور ہر ہر درجہ اپنا الگ حکم رکھتا ہے تو پھر جس درجہ کی تاویل ہے اس کے ڈائلنے

معانی کے اعتبار سے انکار سے ملے ہوئے ہیں۔

قوم کے کہتے ہیں

ہم نے اس نکتہ کی بھی تشریح کی تھی کہ جب ایک گروہ عملہ معاشرہ میں اپنی جدا گانہ حیثیت قائم کر لیتا ہے، اپنی عصیت اور تعلقات و وابستگی کے اعتبار سے کچھ نے مرکزوں کو اپنالیتا ہے، تو وہ ایک الگ قوم ہی رہے گا۔ اگرچہ بعض چیزوں میں یا اکثر چیزوں میں وہ دوسروں سے اشتراک رکھتا ہو کیونکہ قومیت کی صحیح صحیح تعریف یہی ہے کہ ہر وہ رشتہ جو آپ میں عصیت کی لہروں کو تیز کر دلتا ہے عقیدت کی سمتوں کو بدلتا ہے اور آپ میں دوسروں سے مختلف نوع کے جذبات کو برا کیجھتہ کرتا ہے قومیت سے تعبیر ہے۔ اس کسوٹی پر قادریانی حضرات کو پر کھئے، ان کی نمازیں الگ ہیں، مساجد جدا گانہ ہیں اور معاشرتی اعتبار سے اتنی بیگانگی ہے کہ کوئی قادریانی عام مسلمانوں سے رشتہ ناطہ جائز نہیں سمجھتا۔

جدبات کا اختلاف

پھر جذبات کے لحاظ سے بھی اتنی دوئی کہ آپ جن باتوں سے خوش ہوتے ہیں وہ ان کے لئے مطلق خوشی کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً آپ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں خالص اسلامی نظام رانج ہو مگر قادریانی اخبارات نے یہ شے اس برائے کی مخالفت کی۔ آپ کی یہ خواہش ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کی جو لکیر کھینچ دی گئی ہے اب یہ قائم رہے بلکہ زیادہ گھری اور مضبوط ہوتی جائے مگر قادریانی اس خواہش کے اظہار میں قدرتاً مخلص نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک تو ان کا قادریان ہندوستان میں رہ گیا ہے دوسرے اس تقسیم سے آدمی جماعت ”خلیفہ المسلمين“ کی ہدایات و فیوض سے محروم ہو گئی ہے۔ لہذا جب عقیدہ اور

عندیات کے اعتبار سے وہ بالکل دوسری طرح کے محسوسات رکھتے ہیں تو پھر خالص سیاسی نقطہ نظر سے انہیں کیوں الگ قوم نہ کہا جائے۔

یہ مناظر انہ اپنے نہیں

ہم صرف اس نکتے کی اور وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ عام قادریانی حضرات ہماری اس رائے کو محض مناظر انہ اپنے قرار دیں اور بظاہر مخالفت کریں۔ مگر ان کے خواص جانتے ہیں کہ یہی وہ مطالبہ ہے جس کو منوانے کے لئے خود ظفر اللہ نے زور دیا اور ہندوستانی نمائندہ تحریک تبلواد سے یہ کہا کہ ہندوستان میں قادریانیوں کو ایک اہم اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر عام قادریانی سوچیں گے تو انہیں معلوم ہو گا کہ اس میں انہیں کافائدہ ہے وہ ایک مرتبہ اس پوزیشن کو مان ٹیکتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آہستہ آہستہ ان سے پاکستان میں وہی بر تاؤ ہونے لگے گا جو دوسری اقلیتوں سے ہوتا ہے، اور اگر وہ فرقہ کی حیثیت سے ان حقوق و مفادات پر قابض ہونا چاہیں گے جو عام مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے خلاف تتخیل زیادہ تیزی سے ابھریں گی اور یہ کبھی بھی کسی حلقوہ سے انتخاب جیت نہیں سکیں گے۔ (۱)

چوبہ دری ظفر اللہ کا عارضی اقتدار

چوبہ دری ظفر اللہ کے موجودہ اثر و رسوخ سے الگ ہو کر انہیں سوچنا چاہئے کہ ان کا حقیقی فائدہ کس بات میں مضبوط ہے؟ کیونکہ جلد یا بدیر چوبہ دری ظفر اللہ کا یہ اثر بہر آئیہ ان سے چھٹنے والا ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بڑی ملازمتیں بھی کسی گروہ کے لئے کوئی تحفظ نہیں ہوتیں۔ حقیقی تحفظ یہ ہے کہ پاکستان کے دستور میں ان کے لئے مخصوص اقلیت کی حیثیت سے جگہ

ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تجویزان کے حق میں اتنی ہی مفید ہے تو ہم اس کی کیوں تائید کر رہے ہیں؟ جواب یہ کہ دو وجہ سے، ایک تو یہ کہ جب یہ ہم سے الگ ایک گروہ ہیں، دینی اور ذہنی اعتبار سے ان کا راستہ ہم سے جدا ہے، تو کیوں وہ دستور کے لحاظ سے یہ ہم سے الگ نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ عالم اسلام چونکہ ان کے تفصیلی عقائد سے آگاہ نہیں اس لئے فرقے کی حیثیت سے انہیں موقع ملتا ہے کہ ان کو گمراہ کریں اور اپنے غلط پر اپیگنڈے سے ان کے عقیدوں کو متاثر کریں چنانچہ دنیاۓ اسلام میں یہ ہمیشہ اس روپ سے متعارف ہوتے ہیں کہ ہم ایک تبلیغی جماعت ہیں اور اسلام کی سربلندی اور استحکام کے لئے کوشش ہیں حالانکہ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ مہرزاںیت کی اشاعت ہو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تلسیس و فریب کاری کے اس ق遁ہ کا انسداد ہو، عالم اسلامی کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ پاکستان میں ان کی آئینی حیثیت کیا ہے؟ تو پھر وہ ان کے دام میں نہیں پھنسیں گے۔ (۱)

مولف علام طاہ اللہ ثراه نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی کم و بیش 1974ء سے میں برس قبل، ان کے دیدہ بینانے کتنی پر حقیقت بدت فرمائی تھی جس کی تقدیق 1974ء میں مہرزاںیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے بعد کے عالم اسلامی کے رد عمل سے ہوئی کہ جو نہیں یہاں انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا معابدع عالم اسلام کے اکثر ممالک اور بیشتر مسلم تحریمات نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا اور ان کے خلاف عملی کارروائیاں کیں۔ ان کے خلاف رسائل و جرائد میں نہایت قیمتی معلوماتی مقالات تسلیل سے اشاعت پذیر ہونے لگے یہاں کی دینی و سماجی تنظیموں، اداروں اور حکمران و حکام اور علماء کے نام مبارک بادوی۔ تاروں کے انبار لگ گئے۔ متعدد عدالتوں نے انہیں قانونی طور پر غیر مسلم اقلیت اور کافر قرار دیا۔ یہ بہت تفصیل طلب باتیں ہیں۔ جس طرح مہرزاںیوں کے دجل و فریب کا جادو عالم اسلام کے اکثر ممالک میں تبلیغ کے نام پر چلتا رہا یہ بات بعد از قیاس تھی کہ انہیں اتنی جلدی ہر طرف سے

ہم اس شے کے لئے تیار ہیں کہ انہیں ایک اقلیت سمجھیں اور ان سے اسی طرح کا برداشت کریں جس طرح اقلیت سے کرنا چاہئے۔ لیکن ہم اس پر آمادہ نہیں ہیں کہ انہیں اسلام کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

آئندہ دستور میں مرزا یوں کی جگہ

یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کہ مرزا نیت کا مقام اسلامی فرقوں میں کیا ہو؟ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک صحبت میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ انہیں بھر آئینہ مولویین ہی میں شمار کرنا چاہئے اب جبکہ پاکستان نے ایک نئی سیاسی کروٹ لی ہے تو اس میں خواہ کوئی نظام حکومت پلے اتنا تو ہو گا ہی کہ دستور میں ان کی حیثیت کو متعین کیا جائے اور اس حیثیت کے مطابق ان کے حقوق کی وضاحت ہو۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ تاویل کے ہر ہر مرتبہ کا ایک ہی حکم ہو، تاویل کی اصطلاح میں اتنی لپک نہ ہونا چاہئے کہ اسلامی مزاج و نصوص کی صریح مخالفت کے باوجود کوئی گروہ اسلام کے دائرے سے نہ نکل سکے۔ اگر تاویل کے مراتب مختلف کا لحاظ کئے بغیر اس کی ہر ہر صورت کو جائز گوارا کیا گیا تو پھر انکار و ارتداد کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص غیر اللہ کی پوجا کرتا ہے اور اس شرک خالص کے لئے اس سے استدلال کرتا ہے کہ خود اللہ نے اپنے لئے جمع کے صیغوں کو اور جمع کے ضمائر کو استعمال کیا ہے لذرا ضرور اسلام میں شرک کی گنجائش موجود ہے، تو اسے جائز تاویل

میں سبھوں کے اتحاد سندروں میں غوطے لگنے لگے۔ لیکن ہوا وہی جو حضرت ندوی نور اللہ مردہ نے فرمایا تھا کہ ”علم اسلامی کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہم پاکستان میں ان کی حیثیت کیا ہے تو پھر وہ ان کے وام میں نہیں پھنسیں گے“ رہ، ائمہ رحمۃ واعظہ و مغفرۃ۔ (خلد اشرف)

نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کو نو افراد خاصیں سے
تناخ پر استدلال کرتا ہے یا بھائیوں کی طرح آیات قیامت کی تاویل کرتا ہے تو
اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اس لئے قادیانیوں کے مذہبی موقف کو
متعین کرنے کیلئے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ قطع نظر اس کے کہ وہ اجراء نبوت
تک استدلال کے کن پر پچ راستوں سے پہنچے ہیں خود ختم نبوت کا عقیدہ ہمارے
ہاں کس نوعیت کا ہے۔ اگر نبوت اکمال و اتمام کی ان منزلوں تک پہنچ چکی ہے کہ
اب کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہی، اگر آنحضرت ﷺ نے دین کے تمام
مضمرات کو بیان فرمادیا ہے تو آپ ﷺ کے بعد کسی نئے ڈھونگ کی نہ صرف یہ
کہ ضرورت باقی نہیں رہتی ہے بلکہ نئی نبوت کے مائنے سے آنحضرت ﷺ
کے ساتھ جو دلی لگاؤ ہے اس میں فرق آتا ہے کیونکہ جب نیابی آئے گا تو لا محالہ
وہ نئے گروہ کی بنیاد رکھے گا، نئی عصبات کو اجاداً کرے گا اور توجہات و وابستگی
کے پرانے مرکزوں سے لوگوں کو ہٹا کر ان کا رخ اپنی طرف موڑے گا۔

اللہ اقادیانیت کی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ کوئی فرقہ ہے یا
اسلام کی کوئی شاخ ہے بلکہ وہ ایک مذہب قرار پائے گا جس طرح یہودیت کے
بعد عیسائیت ہے اور وہ یہودیت کا کوئی فرقہ نہیں۔ عیسائیت کے بعد اسلام ہے
اور اسلام عیسائیت کی شاخ نہیں بلکہ مستقل دین ہے جس نے منفرد عقائد و
معاشرہ کی بنیاد رکھی۔ ٹھیک اسی طرح قادیانیت اسلام کے بعد ایک مذہب ہے۔
صرف اشتراک عقائد سے بات نہیں بنے گی کیونکہ بنیادی مسائل میں یہودیت
عیسائیت سے الگ تعلیمات کا نام نہیں اسی طرح عیسائیت اسلام سے مختلف نہیں
ہاہم یہ الگ الگ مذہب ضرور ہیں۔ اسی طرح قادیانیت بھی اشتراک عقائد کے

باوجود ایک الگ مذہب ہے۔

صرف ایک فرقہ البتا ان مذاہب میں اور قادریانیت میں ہے اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے سچے نبی ہیں اور مرتضیٰ صاحب جھوٹے۔ مگر اس میں نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ نبی سچا ہو یا جھوٹا بھر آئینہ جب وہ آنحضرت ﷺ کے بعد آکر لوگوں سے اپنی نبوت منواتا ہے اپنے گرد لوگوں کو جمع کرتا اور مسلمانوں کے دینی مزاج کو بدلتا ہے تو لامحالہ وہ نئے مذہب کی بنیاد رکھتا ہے۔ ہماری رائے میں خود قادریانیوں کو اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی ایک شاخ ہیں کیونکہ وہ خود ایسا نہیں سمجھتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ دیانتداری سے عام مسلمانوں کے ساتھ رشتہ داری کو منوع گردانے تھے ہیں ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور ان کے جنازوں میں شریک نہیں ہوتے لہذا خود ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ یہ ایک قوم کی حیثیت سے پاکستان میں رہیں۔ اقلیت کی یہ رعائت بھی ان کے لئے بس ایک ناگزیر رعایت ہے جو حالات کی مجبوریوں سے دی گئی ہے ورنہ خالص اسلامی طرز عمل تو وہی ہے جو حضرت ابو بکر رض نے مرتدین کے مقابلہ میں اختیار کیا۔ یہاں کی ریاست چونکہ ”مشترکہ جدوجہد“ کے ”اصول“ پر منصہ شود پر آئی ہے اس لئے قانون مجبور ہے کہ انہیں شہریت کے تمام حقوق بخشے اور ان کی حفاظت کرے۔

ہمارے نزدیک ایک تعلیم کی حیثیت سے قادریانیت کا موسم گذر گیا ہے اس کے پاس موجودہ پود کے لئے کوئی پیغام نہیں اس دور کے لئے اس کے دامن میں کوئی شے نہیں تجھب یہ ہے کہ اتنا کھوکھلا مذہب کیونکر راجح ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد طبیعتوں میں ایک طرح کی مایوسی تھی ایک طرف انگریز اور امریکہ کے پھیلائے ہوئے پادری اسلام پر حملہ کر رہے تھے، دوسری طرف دیانتِ اسلام کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ مولانا محمد علی مونگیری ”مولانا شاء اللہ“ صاحب مرحوم امر ترسی اور قاضی سلیمان صاحب سلمان منصور پوری ان کے جواب میں سنجیدہ اور متین علمی لڑپچر کا انبار لگا رہے تھے مگر اس میں وہ ادعاء نہ تھا ہمیشہ مسلمانوں نے جس سے دھوکہ کھلایا۔

مرزا صاحب نے اس نفیاتی ماحول سے فائدہ اٹھایا اور حامی اسلام کے روپ میں میدانِ مناظرہ میں کوڈ پڑے اور پھر ادعاء و لافِ زندگی کے ایسے کرشمے دکھائے کہ یہ حضرات اس فن میں ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔

انگریز کے دامن فتنہ پرور نے اس آگ کو ہوادی، پھر کیا تھا انگریزوں کا یہ خود کاشتہ پودا دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ جوالہ بن گیا، اب وہ فضا جو مرزا ایت کے لئے سازگار تھی باقی نہیں رہی۔ انگریز کی سرپرستی ختم ہو چکی ہے، پادریوں کا ذرور بھی ٹوٹ گیا ہے، مباحثہ و مناظرہ کی بساط بھی الٹ چکی ہے اور چونکہ اس کے پاس کوئی پیغام نہیں اس لئے یہ اب صرف چوہدری ظفرالله کے انجشنوں پر زندہ ہے۔ لہذا ان سے کوئی بحث یا لڑائی نہیں اور نہ اب اس سے کچھ فائدہ ہی ہے، ہم ان کو جھوٹا مانتے ہوئے بھی یہ رعائت ان سے برنا چاہتے ہیں کہ انہیں اقلیت کی حیثیت سے آئندہ دستور میں جگہ دی جائے۔



مسئلہ ختم نبوت اور اقلیت

مسئلہ ختم نبوت ایک اصولی مسئلہ ہے جس طرح یہ حقیقت ہے کہ خدا ایک ہے۔ رسالت و نبوت کا ایک معین مفہوم ہے اور حشر و نشر کی معلوم و معروف کیفیتیں ہیں جو کتاب و سنت میں مرقوم ہیں اور اللہ کے ہاں جوابد ہی اور باز پرس کا عقیدہ ہے جو امت کے مسلمات میں سے ہے۔ اسی طرح یہ تصور تمام امت میں متفقہ طور پر دائر ہے کہ اہلام کے بعد کوئی دین نہیں اور آنحضرت ﷺ کی نبوت و تعلیمات جن مزلوں کی نشاندہی کرتی ہیں ان کے آگے معرفت و حکمت کی کوئی منزل نہیں۔ یہی وہ اساس ہے جس پر ہماری پوری دینی عمارت استوار ہوتی ہے اور یہی وہ مدار و محور ہے جس کے گرد عصیت و تعلق خاطر کی تمام شکلیں گردش کرتی ہیں۔ گز شہ چودہ سو برس میں کیا کیا فتنے نہیں اٹھے اور فکر و خیال کی کون کون سی گمراہی ہے تو برپا نہیں ہوئی بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ لغزش و گمراہی کی جتنی صورتیں عقلاء ممکن تھیں۔ ان سب کا وقوع اور فکر و عقیدہ کے جس جس موڑ پر لغزش پا کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ وہ موڑ اسلامی تاریخ کے سامنے آیا لیکن پہ کتنے تعب کی بات ہے کہ اس کے باوجود اسلام کی اکملیت برقرار رہی ہے اور کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے الگ ہو کر کسی ڈھونگ کو وحدت امت کا مبنی تھہرا یا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کچھ مسخروں نے نبوت کا روپ ضرور دھارا اور رسالت کا دعویٰ بھی کیا مگر ان کی حیثیت کبھی ایسی نہیں ہوئی کہ سمجھدیگی سے اس پر غور کیا جائے اور ان کو یہ درجہ دیا جائے کہ مسلمان ادھر متوجہ ہوں اور ان کی تردید کے لئے کمرہ ہمت باندھیں۔ کیونکہ ایک طرف تو اسلام کی دعوت اتنی واضح اتنی مکمل و مسئلہ ہے اور دوسری دعوتوں سے اس

درجہ بے نیاز بنادینے والی ہے کہ اس امر کی کبھی ضررت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ کسی دوسری آواز پر کان دھرا جائے۔ دوسری طرف امت میں باخبری اور دینی فروق کی فراوانیاں اس ڈھنگ سے رہیں کہ ان دعاوی نے انہیں کبھی متاثر ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ فرع سے لے کر اصول تک میں اختلاف رونما ہوا لیکن اس اصل کو کبھی محل بحث نہیں ٹھہرایا گیا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی نبوت کے دروازے کھل سکتے ہیں یا قصر نبوت میں مجرمانہ نقب زنی ممکن ہے۔ شیعہ سنی کا اختلاف کتنا بڑا اختلاف ہے، اس کے بارے میں بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی ایک چیز بھی ان میں مشترک نہیں، جو قرآن اہل السنّت کا ہے اور جن تعبیرات کے ساتھ اس کی تشرع کی جاتی ہے، شیعہ حضرات دیانتداری سے ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں، جن کتب حدیث پر مشرق سے لے کر مغرب تک فرقہ سنت و فقة عمل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک حرف غلط سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں اور تو اور ان کے مجتہدین اور ہمارے آئندہ حدیث و فقة میں اختلاف کی ایک خلیج حائل ہے جس کا پاننا آسان نہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ علاوہ دینیاتی اختلاف کے شیعہ سنی تاریخ تک مختلف فیہ ہے جن بزرگوں کو ہم اپنے اکابر سمجھتے ہیں اور جن کی سیرت و اقوال سے اسلام کا نظریہ حیات مستبط ہوتا ہے، خلافتِ راشدہ کا تصور نکھرتا ہے اور جن کی وساطت سے اسلام کی روشنی ہم تک پہنچتی ہے ان کے نزدیک یہی بزرگ غاصب و ظالم ہیں، معاذ اللہ، اس سے بڑھ کر اور کون سا اختلاف تصور میں آ سکتا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ نبوت ہی کی ایک اصل ایسی ہے کہ جن پر دونوں کا پورا پورا اتفاق ہے، اور یہی اتفاق ہے جو اختلافات کی بولکمنی اور شدت کے باوجود ان دونوں کو صدیوں سے ملائے ہوئے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب تک کوئی گروہ اپنی عقیدت و محبت کو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے اور اپنی طرف سے نئی عصبیتوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور نہ جدید نبوت پر الگ ملت کی عمارت ہی چلتا ہے اس وقت تک اسلامی اخوت اسے اپنے آغوش سے جدا نہیں کرتی اور ہزاروں اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی وہ ملت کا جزو بنا رہتا ہے۔ لیکن جہاں اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ عقیدت سے علیحدگی اختیار کی اور اپنے لیے ایک الگ آستانہِ محبت چنا، اسلام اس سے بیزار ہو گیا، کیونکہ تعلق کی اتنی سی کیفیت ہی تو اسلام ہے۔ یہی باریک فرق ہے جس کو اکثر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھ پاتے کہ مرزائی کیوں اقلیت ہیں؟ جبکہ وہ وہی قرآن پڑھتے ہیں، انہی احادیث کو مانتے ہیں اور اسی فقہ پر عمل پیرا ہیں، اور ان میں اور ہم میں سوا ایک مسئلہ نبوت کے اور کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہی ایک مسئلہ تو ہم میں اور ان میں فارق ہے۔ اور اسی پر ملت کی اساس ہے اور اسی کی بناء پر دینی قومیں معرض وجود میں آتی ہیں۔ یہودی ایک قوم ہیں کیونکہ وہ انہیاء علیہم السلام کے ایک خاص سلسلے کو مانتے ہیں۔ عیسائی ایک قوم ہیں جو اس سلسلے کے علاوہ نبوت کی ایک کڑی کا اس پر اضافہ کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان، عیسائی یا یہودی قومیت کا جزو بننے کی کوشش کریں، عیسائی یہودیت کے دائرة ملت میں گھنے کی سعی کریں۔ حالانکہ جہاں تک عقائد میں وحدت کا تعلق ہے ان سب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور علاوہ نبوت کے اور کوئی بڑا اختلاف ان میں نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ کوئی عیسائی ایسا نہیں جو تورات کو نہ مانتا ہو اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جو تورات کے علاوہ اناجیل کی صداقت اور سچائی کا قائل نہ ہو۔ اگر یہ درست ہے کہ نبوت ایک قوم پیدا کرتی ہے اور ایک معاشرے کی طرح ذاتی ہے تو ہمیں تعجب ہے کہ مرزائی حضرات کیوں مصر ہیں کہ ان کی الگ قومیت نہ ہو۔ اور یہ خواہ مخواہ اسلامی معاشرے کا جز بنے رہیں۔ اگر

ان کو اسلامی عقائد سے بچپنی ہے اور یہ توحید کے قائل ہیں، قرآن کو مانتے ہیں یا سنت کے دفاتر سے جزوی وابستگی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان میں علیحدہ قومیت میں کوئی تاقض نہیں کیونکہ علیحدہ قومیت رکھتے ہوئے بھی یہ اسی طرح ان سچائیوں کو تسلیم کرتے ہیں جس طرح کہ مسلمان یہودی عیسائی کتب کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنا الگ قومی وجود رکھتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان لوگوں نے آخر یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ اگر انہیں اقلیت کی حیثیت سے رہنا پڑا تو ان حقوق سے لازماً محروم اور کنارہ کش ہی ہونا پڑے گا۔ مرازائی اقلیت کی صفت میں آنے سے کیون ڈرتے ہیں؟ کیا ان کے عقائد، تصورات اور جماعتی نظم و نسق کا ڈھنگ پہلے سے ایسا نہیں کہ اس پر اقلیت کا گمان ہو؟

ہمارا روئیندختن دراصل حکومت کی طرف ہے۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ جب اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں کبھی ان وقتوں میں بھی اختلاف رائے نہیں ہوا جبکہ چمن اسلام میں اختلاف کی آندھیاں چلا کی ہیں تو آج ختم نبوت کی نص صریح پر قدغن کیوں ہو اور کیوں اس کی تشریع اور وضاحت کو دفعہ 144 کا ہدف قرار دیا جائے۔ ہم کھلے خزانے کہتے ہیں کہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت اور تعبیر پر پابندیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ حکومت کو اچھی طرح سن رکھنا چاہئے کہ قرآن کے ایک شعہ اور نقطے پر بھی اسلامی حکومت میں کوئی قید گوارہ نہیں اور یہ بات ہونے والی نہیں کہ ظفر اللہ کی خوشنودی کی خاطر اللہ کے غنیظ و غصب کو مول لیا جائے۔

مذہب و ریاست کے موجودہ تقاضے اور نبوت

مرازائیت کے مسئلہ کو ہرگز تک پہنچانے کے لئے ہم نے بحث و فکر کا ایسا

انداز اختیار کیا ہے کہ وہ لوگ جو اس فتنہ کا بد قسمی سے شکار ہو گئے ہیں۔ مناظر ان الجھنوں سے دماغ کو پریشان کئے بغیر ایسے دلوںک سوالات کا سامنا کر سکیں جو رشد و ہدایت کی شاہراہوں پر انہیں ڈال دیں۔ اور آسانی سے انہیں یہ کہہ دیں کہ اس وجل و فریب کی داستان میں مذہب و فلکر کی کون کون گمراہیاں پنهان ہیں۔

لیکن جس مذہب کی پیدائش ہی مغالطوں کی آغوش میں ہوئی ہو، جو بڑھا اور پلا ہی غلط بیانیوں کے سہاروں پر ہو، اس کے مبلغوں سے یہ توقع رکھنا ہی بے کار ہے کہ یہ لوگ منطقی خطوط پر بلحاؤ کے ساتھ کسی موضوع پر غور کر سکتے ہیں۔

بات بالکل سادہ تھی کہ نبوت کی غیرت و خودداری، اس کا مقام بلند، اس کی تعلیمات کا استقلال و تفرد اور اس کے پیغام و سیرت کی استواری کیا اسے اجازت دیتی ہے کہ حکومت باطلہ کی دلیل پر بھکے، اس کی خوشامد کرے اس کے دائرہ اقتدار کو پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے اور دعائیں مانگے اور مریدوں کو تلقین کرے کہ ذلت و تحریر کے اس جوئے کو عزت و افتخار کا طوقِ زریں سمجھ کر زیپ گلوکر لیں اور اس پر اترائیں۔

جواب کے دو ہی پہلو ہو سکتے تھے کہ یا تو یہ ثابت کیا جاتا کہ انگریز کا سایہ واقعی آئیہ رحمت تھا اور اس کو بہر آئندہ قائم رہنا چاہئے تھا اور یا یہ کہ مرزا صاحب نے انگریز کی خوشامد نہیں کی اور پیغمبرانہ رکھا و پر اس سلسلہ میں آئچ نہیں آئے دی۔

ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ سوال اتنا سیدھا، نکھرا ہوا اور صاف ہے کہ لغوش فلکر اور غلط بحث کی کوئی بیہودگی، راہ راست کی نشاندہی سے نہیں روکے گی اور ہر مرزا تی استفار کے اس موڑ پر بخیر و استجواب سے اپنی گزشتہ غلطی پر متنبہ ہو گا اور یہ کہ مرزا صاحب سے علیحدگی اختیار کر لے گا کہ کس عزت فروش اور گھٹیا مدعی کو مان رکھا تھا لیکن

مرزا نیت ذہن پھر آڑے آیا اور قبولیت حق کا یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

آئی تھی اب مزے پ کہانی شباب کی

کس طرف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا

جواب کی ناکام کوششوں سے پہلے مدیر الفضل کو اس پر غور کر لینا چاہئے تھا کہ سوال کی نوعیت کیا ہے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ تاریخ کے کسی دور میں حکومت وقت کے ساتھ تعاون جائز ہے یا ناجائز، بلکہ سوال یہ تھا کہ اس دور میں حکومت و اقتدار کے دائروں نے ایسا پھیلا و اختیار کر لیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر گوشہ پر بالواسطہ یا بلا واسطہ اثر انداز ہے؟ سیاست نے سیٹ اور ریاست کو اس انداز سے پیش فرمایا ہے کہ اس کے اپنے ایمانیات ہیں، اپنے اخلاق اور معاشرتی و معاشی نقشے ہیں، لہذا یہ اس فطرت اور مزاج کے ساتھ، مذہب کی جامعیت، اس کے پھیلا و اور وسعت پر پوری قوت سے حملہ آور ہے۔ لہذا اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو چل سکیں۔ اس لئے یا تو اس دور میں یہ دنیوی ریاستیں چل سکتی ہیں اور یا پھر دینی نقطہ نظر کی تائید کی جا سکتی ہے۔ بیک وقت دونوں کا ساتھ دینا منافقت ہے۔ کیونکہ دونوں نظام اس ڈھنگ کے ہیں کہ پوری پوری اطاعت کے خواہاں ہیں۔ وہ دور گزر چکا ہے جب ریاست نے پاؤں نہیں پھیلائے تھے اور جب یہ ممکن تھا کہ قیصر اور خدا کی حکومت میں تفریق و امتیاز کے تصور نے تنگیل و جامعیت کی اتنی منزیلیں طے کر لیں کہ فکر و عقیدہ کے حلقوں سے لے کر عمل و کردار کی تمام وسعتوں تک اس کا عمل دخل ہے اور دوسری طرف ریاست کے تقاضے اس طرح کے ہو رہے ہیں کہ زندگی کو یکسر مادی سانچوں میں ڈھالا جائے اور کوئی گوشہ اس کا ایسا نہ رہنے پائے جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ یعنی ریاست اب اس پر قانون نہیں ہے کہ صرف نظم و نسق کی زمام تھامے رہے

اور رعایا کو کھلی چھٹی دے دے کہ جس تہذیب و عقیدہ کو وہ چاہے اپنالے کیونکہ آخر میں یہ حکمت عملی اور یہ ڈھیل ریاست کیلئے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ انگریز کی گزشتہ حکومت ریاست کے اسی مفہوم کی مظہروں حامل تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس نے ہماری تعلیم کے رخنوں کو بدل، تہذیب و ثقافت کی سستوں میں تغیر و تبدل پیدا کیا اور اخلاق و عوائد کی پرانی قدروں کے بجائے عربیانی و فناشی کی نئی نئی قدروں کے لئے آہستہ آہستہ دلوں اور دماغوں کو ہموار کرنا ضروری سمجھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ایک نبی کافرش یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسی ریاست اور حکومت کو اپنا کھلا ہوا شمن سمجھے۔ اس کے خلاف صفات آ را ہو، اور ہر ہر مورچے پر اسے شکست دینے کی کوشش کرے۔

اس وضاحت سے کہ مذہب و ریاست کی موجودہ صورت گز شہ صورت سے مختلف ہے حضرت یوسف ﷺ اور حضرت مسح اللہ ﷺ کے موقف سے متعلق غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کیونکہ یہ وہ دور تھا جب مذہب کے معنی چند بچے تلے مفروضات کی اشاعت کے تھے اور ریاست کا تقاضا بھی اس سے زیادہ نہ تھا کہ وہ نظم و اہتمام ملکی کے چند خانوں پر قابض رہے، نہ مذہب نے اس وقت تنکیل کے پر طے کئے تھے اور نہ ریاست اتنا بڑھ پائی تھی کہ دونوں باہم متصادم ہوں اس لئے یہ کہنا کہ چونکہ حضرت مسح علیہ السلام نے قیصر کے حقوق اور خدا میں تفریق روا رکھی ہے یا حضرت یوسف ﷺ نے فرعون کی حکومت سے تعاون کیا ہے الہذا موجودہ دنیوی حکومتوں سے تعاون جائز ہے۔ محض قیاس مع الفارق ہے۔

اس دور کے پیغمبر سے سیاسی خودداری و غیرت کی جو توقعات ہیں وہ اسلام کی جامعیت اور ریاست کے موجودہ تصور و خواہشات کے پیش نظر بجا طور پر پیدا

ہوتی ہیں کہ وہ اس عہد کے سیاسی فتنوں کو بالخصوص منانے گا اور صلیب و سور کی تہذیب کے مخالف محااذ پر جرأت و جسارت سے لڑے گا نہ یہ کہ وہ ان کی تعریف کرے گا۔ جہاد کو منسوخ نہ ہرائے گا، اپنے کو ان کا خود کاشتہ پودا قرار دے گا اور اس پر فخر کرے گا کہ ”میں نے صد ہا کتاب میں جہاد کے مخالف تحریر کر کے عرب، مصر اور بلاد شام اور افغانستان میں گورنمنٹ کی تائید میں شائع کی ہیں۔ (تبیغ رسالت جلد چہارم حاشیہ صفحہ 46) یا یہ کہے گا کہ انگریز میری تلوار ہے اور میں عراق، عرب اور شام ہر جگہ اس کی چک دیکھنا چاہتا ہوں۔ (انجرا الفضل جلد 6، 17 دسمبر 1918ء)

الفضل کا مدرس بتائے کہ یہ تعاون علی البر ہے یا ایسی گھٹیا خوشامد ہے کہ کوئی خود دار شخص اس کا ارتکاب نہیں کر سکتا؟ ریاست کے موجودہ تصور کو ذہن میں رکھئے پھر اس سوال پر دوبارہ غور کیجئے انگریزی حکومت کے معاندانہ کارناموں پر بھی نظر دو ڈائیئے اور اسلامی نظام کے مزاج کو بھی پہچانئے اور بتائیے کہ کیا ہم ایسے ہی خوشامدی اور کتب فرش مدعی نبوت کے منتظر تھے یا کیا یہی نبوت ہے جس کا مقام اس سے کہیں اوپرچا ہے اور اس سے جو توقع قائم کی جا سکتی تھی وہ منسوخی جہاد کی نہیں تھی بلکہ قیامِ جہاد کی تھی۔

رہایہ مسئلہ کہ کن کن بزرگوں نے فتنے کی اس اہمیت کو نہیں پہچانا اور مرتضیٰ صاحب کی طرح انگریز کو غنیمت جانا تو یہ بلاشبہ ان کی غلطی تھی اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ ان میں کوئی بزرگ بھی اگر نبوت کا دعویٰ کرتے تو ہم ان کی بھی یقیناً بڑی سختی سے تردید کرتے اور اس کو کھلے بندوں بہت بڑی گمراہی نہ ہرائے۔

نبوت و رسالت

جھوٹ
اور سچ
کافر ق

- | | |
|-----------------------------------|--------|
| ختم نبوت کے معنی | _____○ |
| روی دا بن العربی کو سمجھنے کے لئے | _____○ |
| نبوت و رسالت کا عام فہم معیار | _____○ |
| پیغمبر مناظر نہیں حکیم ہوتا ہے | _____○ |
| اللہ کا معیار انتخاب | _____○ |
| کیا یہ پیغمبر ہے؟ | _____○ |
| و مختلف دعوے (تجدید.....نبوت) | _____○ |
| مجازی نبی اور ظلی نبی | _____○ |
| نبوت اور ذوق شعری | _____○ |
| جمہوٹا نبی اور سچانی | _____○ |
| دونوں میں فرق کی نوعیت | _____○ |
| خن فہمی بالاخن | _____○ |

اور یہ روایا

آیت تقول کی صحیح تفسیر • پیشین گوئی کا پنجہرہ

ختم نبوت کے کیا معنی ہیں؟

آج کل الغسل میں نبوت کے جاری رہنے کے متعلق بحث ہو رہی ہے اور رومی وابن العربی کی عبارت و اشعار کو ثبوت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انہیں یہ کون سمجھائے کہ ہر موضوع بحث کا ایک وقت ہوتا ہے۔ تیرہ چودہ صدیاں ہوتی ہیں اسلام اس سے فارغ ہو چکا۔ اس نے ایسا مکمل دین پیش کیا، اس طرح زندگی کی گھنیوں کو سمجھایا اور اس طرح ایک نمونہ کا معاشرہ پیش کیا کہ خود دوسرے بول اٹھے کہ مذہب کے بارے میں اس سے اگلا قدم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہاں فکر کی پرواز ختم ہو جاتی ہے اور خیال کی اڑانیں منتہی۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات و عمل کے ذریعے قصرِ نبوت کے درود یوں
کو اس انداز سے پیش کیا کہ ایک ایک اینٹ تکمیل و جامعیت پر شاہدِ عدل قرار پائی۔
کہنے کی بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ ختم نبوت کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اس کا تعلق چند آیات
اور احادیث ہی سے ہو بلکہ یہ تو ایسی حقیقت ہے کہ دین پر سرسری نظر ڈالنے سے خود
بخود ذہن پر مر تم ہو جاتی ہے۔ یعنی روئے زیبا کے لئے نبوت کی کیا حاجت ہے وہ تو
نظرلوں میں نجّ جانے کا نام ہے اور بس! اسی طرح زیبائی و خوبی کا اتنا کمل ہونا، اتنا
جامع ہونا کہ کوئی پہلو اعتراض کا نہ رہے، اس کے لئے الگ قصرِ تع کی ضرورت نہیں
چنانچہ جو شخص بھی اسلام کے اس نقشے کو دیکھے گا جس کو آنحضرت ﷺ نے پیش کیا وہ
پکارائیں گا کہ یہ آخری مرقع ہے حضرتِ مصور کا، خلاقِ اکبر کا۔ جھوٹے نبیوں کو تو
چھوڑ دیئے مسلمہ سے لے کر مرزا صاحب تک کسی نے کام کی بات ہی نہیں کی۔ ان

کے افکار مغض پوچ، دعویٰ سراسر باطل اور سیرت بالکل بیچ، ان کے آنے سے لہر پھر میں ایک حرف جمیل کا بھی اضافہ تو نہیں ہوا۔ کردار و اخلاق کا کوئی پاکیزہ نمونہ نہیں ابھرا اور فکر و تصور کی دنیا میں تو بالکل ہاچل پیدا نہیں ہوئی۔ حکماء و سیاستیں میں ان بڑے بڑے لوگوں کو لجھے جنہوں نے گونوٹ کے جھوٹے دعوے نہیں کئے، وفاتِ مسح کی رث نہیں لگائی، چندہ وصول نہیں کیا اور بیعت کا ڈھونگ نہیں رچایا۔ تاہم ان کے فلسفہ اور خیالات سے اس کا رخانہ آب و گل میں عظیم تغیر و نہما ہوا ہے۔

پھر اس تغیر و انقلاب کا مقابلہ کیجئے اس انقلاب سے جو ایک "امی" نے پیدا کیا اور سوچ سمجھ کر بتائیے کہ اسلام نے خیر و برکت کی جود و لست بانٹی، اس کی کوئی مثال اس میں ملتی ہے۔ اس نے ایمان و اذعان کی جو شمعیں روشن کیں ان کا کہیں وجود ہے۔ اسلام نے جتنا پاکیزہ معاشرہ دنیا والوں کے سامنے پیش کیا آج علم و حکمت کی فراؤں یوں کے باوصف اس کی نظریہ ہے؟ توحید کے بعد عرفانِ الہی کی کوئی اور شکل لوگوں نے دیکھی، نمازوں سے زیادہ بہتر عبودیت و بندگی کے نمونے نظر آئے؟ اخلاق کی وہ پاکیزہ دنیا میں پھر پلٹ کر آسکی؟ اور سیاسیات میں عہد صدقی و فاروقی کی برکات کا اعادہ ہو سکا؟ تاریخ کے ایک ایک ورق کا یہ جواب ہو گا کہ نہیں، یہی ختم نبوت ہے اور یہی *آلیومِ اکملُت لَكُمْ دِینَکُمْ* کی صحیح تفسیر ہے۔

رومی وابن العربی کو سمجھنے کے لئے

افضل کے صفحات میں رومی وابن العربی کا نام بار بار پڑھ کر بڑا تاسف ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمیں دونوں کے افکار سے کہیں کہیں اختلاف ہے۔ بالخصوص وحدت الوجود کے مسئلہ میں لیکن ان کی جلالت قدر اور علمی بلند پائیگی کا کون

انکار کر سکتا ہے۔ انہوں نے توحید و نبوت کے مسائل پر جس اسلوب سے جدت طرازی فرمائی ہے اس کے فہم کیلئے بہر آئینہ گھرے علم اور صحبت صالح کی ضرورت ہے کیونکہ ان بزرگوں نے اپنے مصنفات میں جن جن رموز و اسرار سے متعلق لکھا ہے اس کا تعلق یا تو مقامات و احوال سے ہے اور یا مصطلحات علمیہ سے اور دونوں کا سمجھنا علی الترتیب عمل و علم ہی سے لگاؤ رکھتا ہے۔ عامی کا اس کوچہ میں قطعی گذرنہیں اور ہمارے قادیانی دوستوں کو خوب معلوم ہے کہ ان کے طائفہ میں اس ذوق کا ایک بھی آدمی نہیں۔ اس لئے ان مسائل پر اظہارِ خیال کر کے ان کا بہک جانا بالکل قدرتی ہے۔

صوفیا کے اقوال پیش کرنے ہے پہلے یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کی اپنی اصطلاحیں ہیں جو ذیگر علماء و فقہاء سے الگ ہیں۔ اس لئے یہ جب نبوت یا احوال نبوت پر گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد وہی ثبوت ہونا چاہئے جس کا ان کی کتابوں میں تذکرہ ہے اور جوان کی اصطلاح ہے۔ وہ نبوت نہیں جو قرآن و حدیث میں آئی ہے۔ *و لا مثابة في الا صطلاح* (اصطلاحات کے وضع کرنے میں کوئی جھگڑا نہیں)۔

وہ نبوت جس کے دروازے بند ہیں وہ، وہ ہے جس میں عقائد و تصورات کے مخصوص مجموعے پر یا کردار و سیرت کی معین تشكیل پر یادِ دین کی ایک ہی تعبیر اور ترجمانی پر لوگوں کو اکھا ہونے کی دعوت دی جائے۔ حالانکہ اس میں لغتہ یادوسرے وجود تاویل کے اعتبار سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ اس نبوت کا ہونا اب ناممکن ہے جو ہمارے لئے مدارِ کفر و ایمان بنے یعنی جس کا ماننا تقاضائے ایمان ظہرے اور جس کا انکار کھلا ہوا کفر قرار پائے۔ ایسی نبوت اب نہیں ہو سکتی جو ہماری صفوں کو دو

حصوں میں بانٹ دے۔ ماننے والے مومن کھلا کیسیں اور نہ ماننے والے کافر۔ کیونکہ معیار اور کسوٹی کے پیش نظر یہ شرف اسلام کے ساتھ خاص ہو چکا۔ اس کے صاف صاف یہ معنی ہیں کہ اگر آپ آنحضرتؐ کی رسالت کے قائل ہیں اور دس کروڑ عالموں اور صوفیوں کو نہیں مانتے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں آپ کا ایمان بلاشبہ مکمل ہے یعنی ایک محمد رسول اللہ ﷺ کے مان لینے سے آپ نے اس فکر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہائی پائی کہ اب کسی اور آستان عقیدت کا کھون لگایا جائے۔

انسانی بہبود کے لئے جو کچھ کہنا تھا اسلام کہہ چکا۔ سیرت و عمل کا بہتر سے بہتر نمونہ آنحضرت ﷺ پیش فرمائے اور بد رجہ آخر تعبیر و ترجمانی کے اصول بھی علماء منضبط کر چکے جن کی روشنی میں اختلافی مسائل میں بچھی تلی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ان حالات میں نئی نبوت کیلئے کیا کام اور مصرف باقی رہ جاتا ہے۔ خوب غور کر کے بتائیے۔ بات مناظرہ کی نہیں غور و فکر کی ہے۔ برہیں ان بزرگوں کی تصریحات تو ان کے ہاں جو کچھ جاری ہے۔ وہ فکر و نظر اور قلب و بصر کی فتوحات کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ نبوت ان کے ہاں ولایت ہی کا ایک پہلو ہے کیونکہ ولایت کا مفہوم ان کے نزدیک نبوت سے زیادہ عموم لئے ہوتا ہے یہ اس نبوت سے قطعی بحث نہیں کرتے جو کفر و ایمان کی کسوٹی بنتی ہے۔ جو مخصوص گروہ پیدا کرتی ہے۔ یا متعین معاشرہ تعمیر کرتی ہے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھو کر یہ نظر جو کچھ دیکھ سکتی ہے اس کے امکانات ہمیشہ قائم رہیں گے۔ یہ دل و دماغ جتنا اوپنجا اڑ سکتا ہے، اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ غور و فکر اور مراقبہ و مشاہدہ کے دروازے دامنًا کھلے رہیں گے۔ لیکن جو چیز بند ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ اب کسی شخص کو مدار کفر و ایمان بنانے کرنے نہیں بھیجے گا۔

نبوت و رسالت کا عام فہم معیار

انبیاء علیهم السلام کے آنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وقت کے کچھ سوالات ہیں جو ابھر رہے ہیں کچھ تقاضے ہیں جن کا زندگی کا چوکھتا بنانے میں حصہ ہے، کچھ خیالات و افکار ہیں جو ذہنوں کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ انبیاء علیهم السلام آگر ان سوالات کے مقابلہ میں ایک منعین موقف اختیار کرتے ہیں ان تقاضوں کے اعتبار سے اسلامی برداشت کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کے ان نظریات میں جو سوالات پھیل رہے ہیں اور پھیلائے جا رہے ہیں حق و صداقت کی مقدار کتنی ہے، وہ سچائیوں کو قبول کرتے ہیں اور ان سچائیوں میں ملے ہوئے جھوٹ کو نکھرا دیتے ہیں۔ ان سے پہلے پوری زندگی کا ایک نقشہ ہوتا ہے جس پر لوگ عمل پیرا ہوتے ہیں اور ان کا فرض منصبی ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس پورے نقشہ کا جائزہ لیں، نقشہ کی ایک ایک تفصیل کو دیکھیں اور پھر اصلاح و ہدایت کا جو پروگرام پیش کریں اس میں پوری زندگی کا پھیلاؤ ہو، وہ بتائیں کہ معقدات میں کیا کیا خامیاں ہیں اور عمل میں کس کس انداز کی کوتاہیاں ہیں۔

یعنی اس وقت کی پوری تمدنی و معاشی زندگی پر حکیمانہ انداز سے نظر ڈالیں اور اس وقت کے تمام مضررات و امکانات کو سامنے رکھ کر جس وقت و عصر کے وہ پیغمبر ہیں ایک چالا لائج عمل لوگوں کے سامنے پیش کریں..... اس میں وقت کے وہ تمام سوالات سمٹ کر اس طرح آجائیں کہ بحث و نظر کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے۔

یہ واضح رہے کہ نبوت کے جمال جہاں آراء کی یہ صرف ایک جھلک ہے یا یوں کہنے کہ صرف ایک پسلو ہے نظر و فکر کا، ورنہ اس باب میں اور بھی کئی چیزیں کہنے کی ہیں جو آئندہ پیش آئندہ مناسبوں کے مد نظر انشاء اللہ پیش کی جائیں گی۔ جب یہ اصول طے ہو گیا کہ پیغمبر کی ٹرف نگاتی وقت کے تقاضوں کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتی اور باریک سے باریک مکنونات کو بھی ٹھول لیتی ہے تو اب اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھاؤ نہیں رہے گا کہ اس کی بعثت و تبلیغ سے خود زمانہ یا عصر کس حد تک متاثر ہوتا ہے اور یہ زمانہ یا عصر کیا شے ہے؟ آئیے اس سوال پر بھی لگے ہاتھوں غور کر لیں۔ زمانہ تعبیر ہے ان قوتوں سے ان عوامل سے اور خیالات و افکار کی ان موجودوں سے جو زندگی کی زنجیر بنانے میں حصہ لیتی ہیں اس قدر جانتے کے بعد اب نبوت کے رد فعل کو معلوم کر لینا دشوار نہیں رہے گا کہ اس کی تعلیمات اس نجح کی ہونی چاہیں کہ ان سے وقت کی تمام قوتیں لرزہ براندام ہوں۔ تمام عوامل خائن ہوں اور تصورات و نظریات کے تمام حلقوں نئی شکل میں ڈھلنے کیلئے آمادہ، غرض یہ نہیں کہ ان میں ہر ایک کو اپنی زندگی میں کامیابی بھی نصیب ہو اور وہ اس حد تک کامران و خوش بخت بھی ہو کہ بہر آئینہ ایک نمونے کا معاشرہ قائم کر کے دنیا سے رخصت ہو بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کے پیغام اور دعوت میں انقلاب آفرینی اور تغیر و تعمیر کی پوری صلاحیتیں موجود ہوں۔

اس سلسلے کی ایک اہم کڑی اور ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد نتائج خود بخود آپ کے ذہن میں آنا شروع ہو جائیں گے اور وہ ہے حکومت، ریاست یا ہیئت حاکمہ، یہ ہے زمانہ کا اولین مفہوم یا نبوت کا حقیقی مخاطب، یا حریف، اس

کی یہ کوشش رہتی ہے کہ خیالات و افکار اور رسم و رواج کے سانچے اس طرح ڈھلیں کہ جس سے اس کے اقتدار کو بھیں نہ لگے لہذا نبوت کی زد میں سب سے پہلے وقت کی یہی حکمران قوتیں آتی ہیں سب سے پہلے انہی ایوانوں میں ایک جھٹکا اور زلزلہ محسوس ہوتا ہے یعنی عوام الناس سے بھی قبل نمرود دعوت ابراہیم کے دور رس نتائج پر نظر ڈالتا ہے اور بنی اسرائیل اور قبطیوں سے بھی پیشتر خود فرعون اس کا دھڑکا دل میں پاتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد مسئلہ بڑی حد تک نکھر گیا ہے۔ اب یہ بتائیے کہ مرتضیٰ صاحب کے ادعائے نبوت سے وقت کے کتنے تقاضوں کا جواب ملا اور وقت سے کون کون سے سوال حل ہوئے اور انگریزی حکومت ان کی دعوت سے کس حد تک متاثر ہوئی گورنمنٹ ہاؤس میں کیا غلغله ہوا اور بینگھم پلیس میں کماں کماں شگافوں نے منہ کھولا، جواب میں اتنی ماہی اور قتوط ہے کہ اسے جواب سے تعبیر کرنا ہی غلط ہے۔ مرتضیٰ صاحب کے سارے لڑپچر کو کھنگال ڈالنے کے بعد بھی دعوت یا پیغام کے قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی، وقت کے وہ سوالات جن پر ان کے معاصرین نے نہایت خوبی اور بلاغت سے بھیں کی ہیں ان کی مصنفات کے صفحات ان سے بالکل تھی ہیں۔ ان کی کتابوں سے یہ بالکل متریخ نہیں ہو پاتا کہ یہ کوئی سلیمان ہوا پروگرام لائے ہیں یا ان کی کوئی دعوت ہے یا موجودہ عصر کے تہذیبی و ثقافتی رجحانات کے خلاف یہ اپنے مستقل بالذات خیالات رکھتے ہیں یا اسلام ہی کی کوئی ایسی تعبیر پیش کرنا چاہتے ہیں جو وقت کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر سکے اور اسلامی موقف کو موجودہ نظریات کی روشنی میں زیادہ وضاحت سے بیان کر سکے۔

ان میں سے کسی چیز کو بھی مرزا صاحب نے چھوٹا تک نہیں۔ تمام تقسیمات گھنیا قسم کی مناظرانہ بخشوں سے معمور ہیں، جن میں نہ تنقید کا کوئی اصول مدنظر ہے؟ نہ صحت مند طرز نگارش کی کوئی جھلک اور حکومت کے سامنے تو انہوں نے یوں پوٹائیک دیا ہے جس پر آج پرانا یونیورسٹ بھی شرم جائے۔ اب اگر یہ نبوت ہے تو پھر ہمیں بتا دیجئے کہ ڈھونگ کے کتنے ہیں؟

پغمبر مناظر نہیں حکیم ہوتا ہے

جس طرح حاذق طبیب کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ مریض کی ایک ایک بیماری کو پہچانتا ہو اور پھر اسے یہ بھی معلوم ہو کہ ان بیماریوں میں زیادہ اہم اور توجہ طلب بیماری کون ہے؟ نہیک اسی طرح انبیاء علیهم السلام کا ہاتھ قوم کی نبض پر ہوتا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جسم و روح پر کن کن امراض کا جملہ ہے پھر انہیں اس شے کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کن عوارض کا علاج پلے ہونا چاہئے اور کون عوارض بعد میں توجہ طلب رہیں گے۔ پھر جس طرح اصلی شے تشخیص ہی نہیں اور بیماریوں کے مدارج مختلف کی پہچان ہی نہیں بلکہ معالجہ ہے یعنی اچھا اور کامیاب طبیب وہی نہیں جو ایک نظر میں عوارض کی تھے تک پہنچ جائے بلکہ وہ ہے جو اس انداز سے مریض کا علاج کرے جو واقعی اس کے لئے صحت بخش اور مفید ہو، یہیں سے ایک طبیب اور حکیم کی راہیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ طبیب صرف علامت ظاہرہ کو جانتا ہے ادویہ اور ان کے خواص کی معرفت سے بہرہ مند ہے۔ اس سے زیادہ نہیں اور حکیم کی نظر مریض کی حالت نفسی پر بھی رہتی ہے اس کا بھی علم ہے کہ معالجہ کے مختلف و متعدد طرق میں سے کون طریق ذہنی و نفیساتی اعتبار سے زیادہ مفید رہے گا کیونکہ ایک مریض

طبیب سے جو بنیادی توقع رکھتا ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ جسم سے پہلے اس کی روح کو چارہ سازی کی افادیت کا لیقین ہو جائے اور بیماری نے پے درپے حملوں سے جن صلاحیتوں کو ختم کر دیا ہے وہ پھر لوٹ آئیں علاج و معالجہ اس کے بعد کی شے ہے۔

اسی طرح ایک پیغمبر کی کامیابی یہی نہیں کہ وہ قوی جسم کے تمام عوارض سے آگاہ ہو بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کا طریق علاج حکیمانہ ہو، اس میں یہ رعائت رکھی گئی ہو کہ نسخہ ایسا تجویز ہو کہ جس سے روح کی بالیدگی کا اہتمام سب سے پہلے ہو، علاج اس ڈھنگ سے ہو کہ ذہن کی تازگی اور قلب کی بثاشت سب سے پہلے پلٹ کر آئے۔ نبوت کا یہ عام پیمانہ ہے جس کی تعین کے لئے بہت بڑے علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اس کے حدود سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہے اور اس کے مذاق سے آشنا ہے اس کو جانے گا۔ آئیے اس صدی کے قومی امراض کا جائزہ لیں اور پھر دیکھیں کہ بحیثیت مریض کے ہماری توقعات ایک پیغمبر سے کیا ہو سکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا عارضہ جس سے ہم دوچار ہوئے اور اب تک جس کے اثرات سے ذہن محفوظ نہیں ہیں وہ مرعوبیت کا عارضہ ہے۔ انگریزی عمد اقتدار میں احساس کمتری کا ہم اس شدت سے شکار ہوئے کہ ہماری ہربات سے ایک طرح کی بے چینی ملنے لگی۔ سیاست سے لے کر مذہب تک میں معدرت طلبی کا عصر غالب رہا۔ ذین سے متعلق ہماری بڑی سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح مغربی خیالات و تصورات سے اس کی ہم آہنگی ثابت ہو جائے اور ہم دوسرے سے بیانگ دہل یہ کہہ سکیں کہ ہمارا مذہب بحمد اللہ عقل و فکر کی جدید کسوٹیوں پر پورا

اترتا ہے۔ حالانکہ یہ نقطہ نظر مذہب کی موت تھا۔ کیونکہ یہ تو اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب اس کی حیثیت ایجادی اور جارحانہ ہو جب یہ زمانہ کے اغلاط پر اہل زمانہ کوٹ کے، نظری و عملی گمراہیوں پر ڈائنسے اور خود اعتماد و عقل میں سمیا ہوا زندگی کا ایک ڈھب پیش کرے ورنہ علم کلام کی لیپاپوتی اور نئے نئے تصورات حیات کی تائید و نصرت اس کی گرتی ہوئی دیواروں کو نہیں بچا سکتی۔ مذہب جب تک آگے آگے رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جہاں اس کی حیثیت شانوی ہوئی ختم ہو گیا۔ یہ قائد بن کر دنیا میں آتا ہے اور اپنی قیادت سے عمر بھر دستبردار نہیں ہوتا۔ اس کی غیرت و خودداری تبع و اطاعت کی ذلتیں کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اس معدورت طلبی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی تصور صرف "مناظرہ" بن کر رہ جاتا ہے یعنی اس میں وہ بھاری بھر کم پن طبعی سنجیدگی، ایجادیت اور وقار نہیں رہتا جو اس کی وہ خصوصیات ہیں جو کبھی جدا نہیں ہوتیں بلکہ یہ صرف اکھڑے کی ایک شی ہو کے رہ جاتا ہے اور ظاہر ہے مذہبی اٹھاٹخ کا نام ہرگز نہیں ہے یہ ایک پیغام سے تعبیر ہے جو حد درجہ سنجیدہ ہے۔ ایک دعوت کا نام ہے جس میں ایجاد و اثبات کے کامیاب پہلو نمایاں ہیں۔ مذہب زندگی ہے، تمت زندگی نہیں، اللذا ہمیں ایک مدعی نبوت سے جو توقع ہو سکتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ مناظرہ بازی اور سنتی کتب فروشی سے بالاتر ہو کر مذہب کے تصور کو اس دلکشی سے پیش کرے، ایسی ایجادیت کے انداز میں وہ رائے کہ مغربی علوم کی آمد آمد سے جو ایک طرح کی مرعوبیت زہنوں پر طاری ہو گئی تھی وہ دور ہو جائے۔ اسلام کی تعبیرائیے ڈھب سے لوگوں کے سامنے آئے جس میں مناظرانہ چھپھور پن نہ

— مرزا نیت نے زادیوں سے

ہو، بحث و جدل کی سطحیت نہ ہو، ایک پسلوان کی اکھاڑ پچھاڑ نہ ہو بلکہ ایک حکیم کی سوچ بوجھ ہو، ایک فلسفی کی متناسن ہو اور پاکیزہ سیرت ہو، ایسا سلجنچا ہوا عمل ہو اور عملی زندگی کا ایسا پیارا نمونہ ہو کہ جس کی ایک ایک ادا پر اس وقت کے نظریات حیات خود بخود شمار ہوں، ہمیں مناظرہ سے نفرت ہے۔ اس سے زیادہ غیر معقول، غیر وینی اور غیر نفیاتی حرہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس کامداق عام اس وقت ہوتا ہے جب کسی قوم سے سیرت کی محکمی اور دلائل کی شوکت رخصت ہو جاتی ہے جب زندگی و عمل اور نمونہ و اسوہ کی جاذبیتیں جواب دے جاتی ہیں، یہ ایک طرح کی مذہبی سو فسطائیت ہے جس کے بطن سے صالح اور عمدہ منطق کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے ظہور پذیر ہونے والی چیزیں کیا ہیں؟ جھگڑا، مناقشہ اور بد ذوقی یا ایک طرح کا مراق، اب یہ فرمائیے مرزا صاحب کا سب سے بڑا تحفہ کیا ہے جو انہوں نے ہمیں مرحمت فرمایا یہی ”مناظرہ“ یعنی پوری قوم لال کتاب ہاتھ میں لئے ایک دنیا سے دست، و گریباں ہے، حوالہ سے حوالہ اور ورق سے ورق نکرا رہا ہے، انبیاء علیم السلام کا ورثہ یقیناً یہ تحریر چیزیں نہیں ہو سکتیں وہ جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ ذہنوں کی بالیدگی ہوتی ہے۔ فکر کا سلجنچا ہوتا ہے اور عمل کی پاکیزگی، مناظرہ، معدورت طلبی اور بحث و جدل کی قیل و قال سے ان کی تبلیغی سطح کیسی بلند ہوتی ہے۔

اللہ کا معیار انتخاب

انبیاء علیم السلام کو چونکہ دنیا میں اس لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ اللہ کے پیغام کو اس کے ان بندوں تک پہنچا دیں جو فکر و عمل کی گراہیوں میں بنتا ہیں۔ اس لئے انہیں قول و عمل کی وہ تمام جاذبیتیں عطا کی جاتی ہیں جو نفس دعوت کو

مقبول و محبوب ٹھہرانے کیلئے ضروری ہیں۔ انبیاء علیهم السلام کا مبعوث ہونا اللہ کے انتخاب سے ہے۔ لہذا جب وہ کسی بندے کو پنے گا تو اس کا انتخاب کتنا صحیح اور کس درجہ بلند ہو گا؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلے انبیاء علیهم السلام کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے، انہیں روح و معنی کی تمام خوبیوں سے نوازا گیا، قلب و دماغ کی ہر ہر صلاحیت سے بہرہ مند کیا گیا، سیرت و عمل کے ہر ہر ظہور سے مشرف فرمایا گیا اور اسوہ و کردار کی ایسی ایسی خصوصیتیں بخشی گئیں جن سے ان کی محبوبیت و دلنوازی میں اور اضافہ ہو گیا۔ انبیاء علیهم السلام کو محبوبیت و دلنوازی کی ان تمام ادواں سے اس مقدار کے ساتھ اس لئے آراستہ کر کے بھیجا جاتا ہے تاکہ کشش و جذب کی یہ کیفیتیں عوام کو ان کا گرویدہ بنا دیں اور یہ اللہ کے پیغام کو زیادہ کامیابی کے ساتھ دل کی گمراہیوں میں اترادیں۔ یوں توبنوت کے بے شمار فیوض اور ظہورات ہیں لیکن ایک فیض یا ظہور ایسا ہے جس کا نبوت سے بڑا قربی تعلق ہے اور وہ ہے حسن بیان، گفتگو اور اظہار مدعایا صحیح مذاق، تحریر و ادب کی سحر طراز چاشنی یا فصاحت و بلاعثت کی مجرزان صلاحیتیں، فصاحت بلاعثت کی تعریف میں اہل فن نے بڑی بڑی مشکلگانیاں کی ہیں۔ آپ اختصار کے ساتھ یوں سمجھ لیجئے کہ حسین ترین معنی اگر حسین ترجمہ لفظی اختیار کر لیتا ہے تو اس کا نام فصاحت ہے اور انبیاء علیهم السلام کے درجہ فصاحت پر یوں غور فرمائیے کہ انہیں جو کلام دیا جاتا ہے، اس میں براہ راست اس خلاق حسن و خوبی کی بخششوں کو دخل ہے جس کی ہلکی سی توجہ سے یہ سارا گلستان وجود ممک رہا ہے۔ عہد نامہ جدید و قدیم بڑی حد تک محرف ہے مگر آج بھی سیدنا داؤد علیہ السلام کا زبور پڑھو، سیدنا سلیمان علیہ السلام کے امثال سنوہ

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مواعظ پر غور کرو جو بابل میں کتنی جگہ مذکور ہیں۔ انجیل کی زبان اور تیور دیکھو، تمہیں اندازہ ہو گا کہ انبیاء علیمِ السلام کے بیان میں کس درجہ بلاغت، کتنی شوکت و حشمت اور کس درجہ رکھا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں پھر قرآن کو دیکھو جس میں نظم کی سی موزونیت، شعر کا ساترجم اور نثر کا ساپھیلاو اور وسعتیں ہیں جو بیک وقت نظم و نثر کی تمام خوبیوں کا حامل ہے، ایک ایک لفظ نہیں، ایک ایک شوشه اور نقطہ کتنا تیکھا اور کتنا شوخ ہے۔ انداز بیان کتنا مدلل، کتنا شیریں اور پراز معنی ہے، سینکڑوں تفسیریں لکھیں اور ہر تفسیر میں اس کے حسن و جمال اور معنی و مغز کو اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن نہ تو گمراۓ معانی ختم ہوئے اور نہ اس کے حسن و جمال کی داستانیں ہی کم ہوئیں اور خدا ہی جانتا ہے ابھی کتنے رازی، کتنے زعفری، کتنے ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہم اللہ علیہ پیدا ہوں گے اور قرآن کے حکم و اسرار کے کیا کیا یہ انسان کے ذوق ادب کی تسلیم کا سامان بھیم پنچائیں گے۔ احادیث پر اس نقطہ نظر سے غور کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کا یہ مجموعہ کتنے نوادر ادب اپنے اندر پھاٹ رکھتا ہے۔

ان کو رذوقوں سے بحث نہیں جنہیں دین کی صحیح سمجھہ ہی عطا نہیں ہوئی، جن لوگوں نے باقاعدہ ریاض نبوت کے ان گل بولوں کو دیکھا ہے جن کی ترتیب و ترتیم میں محدثین نے بڑی بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں وہ جانتے ہیں کہ تنا ان کی ادبی حیثیت کتنی اوپنجی ہے۔ انبیاء علیمِ السلام جمال اپنے ماننے والوں کو زندگی کا ایک صحیح نظام عطا کرتے ہیں، زمانے کی گھنیوں کو سلحوتاتے ہیں، عمل و سیرت کے نقوش کو اجاگر کرتے ہیں اور تہذیب و ثقافت کے ہزاروں باریک نکتے

سمجھاتے ہیں، وہاں قوم کو ذوق ادب بھی عطا کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انبیاء علیهم السلام ایک معیار اور نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے جس ذوق اور جس معیار کے حامل ہوں گے اسی طرز کا ذوق و معیار ان کے ماننے والوں میں بھی ابھرے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس نعمت سے خصوصیت سے نوازا گیا ہے۔ آج بھی دنیا بھر کے ادب کو کھنگال ڈالنے خالص ادبی حیثیت سے اسلامی لٹریچر کا جائزہ لیجھے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں جو جمال ہے، جو رعنائی اور خوبیاں ہیں وہ کہیں نہیں ملیں گی، یہ ایک مستقل موضوع ہے، تحقیق و تقدیم کا کہ، دنیا کے لٹریچر میں اسلامی ادب کا کیا مقام ہے؟ یقین جانئے کہ جب کبھی اس پر غور کیا گیا اور لکھا گیا تو یہ بجائے خود ایک بہت بڑی خدمت ہو گی عالمی ادب کی، اس مختصر تتمید کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ نبوت بھی ایک حسن ہے اور حسن کی پہچان کے جمال اور بیسمیلوں پیانا نے ہیں وہاں ایک پیانا ادب و ذوق کی شانستگی کا بھی ہے اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پیانا نسبتاً زیادہ واضح ہے۔ اس صدی میں جب ایک شخص ادعائے نبوت کے ساتھ ہمارے سامنے آئے گا اور قرآن کے اس معیار کے بعد آئے گا تو لامجالہ ہم سب سے پہلے اسی پیانا سے اسے جانچیں گے۔ ہماری کم سے کم توقعات اس سے جو ہوں گی وہ یہ ہوں گی کہ اس نے اگرچہ قوم کے سامنے کوئی ناجھ عمل نہیں رکھا، زمانے کے مسائل کو نہیں سمجھا، موجودہ تقاضوں پر نظر نہیں ڈالی، سیرت و عمل کے اعتبار سے کوئی بلند تر نمونہ نہیں چھوڑا، کم از کم اتنا تو کیا ہوتا کہ ابوالکلام کا ”الہلال“ اس کے جمال ادبی کے سامنے گئنا جاتا۔ حالی کا وہ مسدس جو نصف صدی سے گونج رہا ہے

خاموش ہو جاتا اور حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کی شاعری اس کی چاکری کرتی، یہ کیا بدمناسی ہے کہ براہین احمد یہ شب بھراں سے بھی زیادہ طویل ہونے کے باوجود ایک پیرا اور جملہ اپنے اندر ایسا نہیں رکھتی کہ جس سے ذوق کی تسلیم ہو سکے۔ کیا یہی نبوت ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا معیار بھی معاذ اللہ بدلتا رہتا ہے۔ یعنی یا وہ زمانہ تھا کہ زبور عطا کرتا تھا جس سے پہاڑوں کے کلیجے متاثر ہوتے، طیور اس کے نغموں پر سرد ہنتے، وہ انجلیل اتارتا، جس سے کہ یونانی و رومی اپنی حکمت و فلسفہ بھول جاتے اور ان لوگوں کے پیچھے ہو لیتے جنہوں نے کہیں تعلیم نہیں پائی۔ قرآن میں ادب کے ان ان مجذرات کو نازل فرماتا کہ مخالفین بھی سنتے تو رقت طاری ہو جاتی۔ (تفییض اعینہم من الدمع) اور اب یہ حال ہے کہ ”خاکسار پیپر منٹ“ اور ”مکترین کا بیڑا غرق“ ایسے عجائب سے نوازا جا رہا ہے؟ کیا یہ العامت اسی چشمہ علم و حکمت کا ترشیح ہیں جس سے زبور کے نفہ ہائے شیریں نے استفادہ کیا جس کی سطح سے سلیمان علیہ السلام کے امثال و کلمات ابھرے جس سے انجلیل نے فیض پایا اور سب سے آخر میں جس کی تخلیات نے قرآن کی ایک ایک آیت کو روشنی بخشی۔

کیا یہ پیغمبر ہے؟ (ایک نفیاتی تجزیہ)

نبوت کی پرکھ کے کئی انداز ہیں، ایک انداز اس کی روزمرہ کی زندگی کا ہے، اس میں ایسا سلجنخا، ایسی پاکیزگی اور بلندی ہونا چاہئے کہ وہ عام انسانوں سے قطعی مختلف ہو، ایک انداز دوسروں سے معاملہ کا ہے، یہ بھی ایسا ہونا چاہئے کہ اس پر ”حقوق العباد“ کی بنیاد رکھی جاسکے۔ کچھ لوگ مجذرات و خوارق کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں گے اور کچھ لوگ صرف تعلیمات کو معیار نہ رہائیں

گے کہ اس سلسلہ کی اہم کڑی یہی ہے کیونکہ اگر ایک شخص دعویٰ نبوت کے ساتھ ایسا پیغام بھی پیش کرتا ہے جو تمام انسانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور جس سے زندگی کی تمام الجھنیں دور ہوتی ہیں تو بلاشبہ یہ اللہ کا پیغمبر ہے اور اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ انبیاء علیهم السلام کی پہچان کی یہ مختلف کسوٹیاں اس لئے ہیں کہ ہر شخص کا ذوق دوسرے سے علیحدہ ہے اور وہ مجبور ہے کہ اپنے ذوق کی رعایت بہر آئینہ ملاحظہ رکھے۔ علم الاخلاق کے نقطہ نظر سے ایک شخص یہ دیکھے گا کہ یہ شخص جو نبوت کا داعی ہے کس ذہب کے اخلاقیات کو پیش کرتا ہے؟ کیا یہ کسی منضبط نظام کے تابع ہے؟ کیا اس لائق ہے کہ اسے انسانی معاشرہ کے سامنے بطور نصب العین کے پیش کیا جائے۔ عمرانیات کے ماہریوں دیکھیں گے کہ یہ جس ضابطہ حیات کو پیش کرتا ہے کیا اس سے زندگی کی گاڑی کامیابی سے آگے بڑھتی ہے؟ اور ایک سیاسی دماغ اس کی دعوت میں ایک ایسے چوکٹھے کی تلاش کرے گا جس میں ایک ہموار، متوازن اور صحیح صحیح زندگی کے نقشے کی تمام چولیں عمدگی سے بٹھائی جا سکیں۔ غرض نبوت ایک ایسی سچائی ہے جس کو کسی کسوٹی پر پرکھئے، کسی ذہب سے دیکھئے اور کسی ترازو سے تو لئے یہ سچائی ہی رہے گی اور اس کے وزن یا قیمت میں سرموفرق نہیں پیدا ہو گا۔ آج ہم قارئین کے سامنے فکر و نظر کا بالکل نیا پیانا پیش کرنا چاہتے ہیں جس کو ملاحظہ رکھ کر مرزا صاحب کی پیغمبرانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا ایسا شخص کسی عقلی اعزاز کا مستحق ہے وہ پیانا ہے نفیات کا اور یہ وہ فن ہے جس سے ایک شخص کے اس مزاج کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا ہے۔ خارجی زندگی جس کا مظہر ہوتی ہے کیونکہ نفیات کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر طور

تابع ہوتا ہے اس بنے اور ڈھلنے ہوئے نظام کے جس کا گمرا تعلق ہمارے نفس باطن سے ہے، یہ نظام یا مزاج نفسی جتنا اعلیٰ اور باقاعدہ ہو گا ہماری خارجی زندگی بھی اسی نسبت سے اعلیٰ اور باقاعدہ ہو گی اور پیغمبر کے متعلق یہ بھی نہ بھولئے کہ جہاں وہ حق و صداقت کا پیکر ہوتا ہے وہاں اس کا نفیاتی مزاج بھی نہایت عمدہ، نفیس اور منضبط ہوتا ہے۔

اس علم کی دسترس اتنی زبردست ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے زندگی کے بڑے بڑے بھید معلوم ہو جاتے ہیں، چند مثالوں سے اس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کیجئے، فرض کیجئے ایک شخص کے بال الجھے ہوئے ہیں اور وضع میں بے قاعدگی اور بے ترتیبی ہے تو اس سے یہ معلوم ہو گا کہ اس کے ذہن میں سلچھاؤ یا قرینہ کا احساس مفقود ہے یا یہ شخص جمالیات کے ذوق سے قطعی محروم ہے۔ ایک شخص کی یہ عادت ہے کہ جب سوتا ہے تو پوری طرح منہ ڈھانپ کر، اس سے اس کی یہ کمزوری معلوم ہو گی کہ یہ زندگی کے مصائب میں گریز اور فرار کو زیادہ پسند کرتا ہے اور اس میں مقاومت اور مقابلہ کی صلاحیتیں کم ہیں، اسی طرح فرض کیجئے ایک شخص بار بار گفتگو کرتے وقت اپنے متعلق زیادہ تفصیلات بیان کرتا ہے اور اپنی ذات کو بات چیت کا مرکز و محور ٹھہرا تا ہے تو ایسا شخص اس وہم میں جلتا ہے کہ لوگ اس میں کم دلچسپی لیتے ہیں حالانکہ وہ اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو شخص بلا ضرورت اپنی پرہیز گاری کے ڈھونڈرے پہنچتا ہے وہ در حقیقت اس جھول کو دور کرنا چاہتا ہے جو اس کی واقعی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ہماری زندگی کی ایک ایک حرکت ایک ظہور پر نتھے نظام کے تابع ہے جو ہمارے باطن میں کار فرماتا ہے، اس اصول کو سامنے

رکھئے اور سردست مرزا صاحب کی ایک حرکت کا نفیاتی جائزہ لیجئے۔

آپ کی کتاب ہے ”نور الحق“ اس میں پادری عما الدین کے خرافات کا جواب مندرجہ ہے، ہم جواب کی اہمیت پر غور کئے بغیر جو تکڑا غورو فکر کے لئے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک جگہ بھنا کر اپنے پادری عما الدین کو ملعون قرار دینا چاہا ہے، ہم اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ علی اور اردو میں اس کے معنوں میں کیا اختلاف ہے، جو چیز غور طلب ہے وہ ملعون قرار دینے کی نوعیت ہے، آپ نے لعنت کی جو گرداں شروع کی ہے تو ان کا نمبر پورے ایک ہزار تک جا پہنچایا ہے۔ یعنی کتاب میں ایک ہزار مرتبہ گن کر اور اس پر باقاعدہ نمبر ڈال کر، لعنت کا لفظ زیب قرطاس فرمایا ہے۔ بتائیے نفیات کے اولیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس حرکت کی آپ کیا توجیہ فرمائیں گے۔ یہ واضح رہے کہ موقع کی مجبوری سے علیہ اللعنة کہہ دینا یا یہ کہنا کہ اس پر ہزار لعنت ہے یہ اور بات ہے، ہم اس کے جواز و موقع جواز پر نظر نہیں ڈالیں گے اور گن گن کر ہزار مرتبہ لعنت لعنت کی گرداں کرنا بالکل شے دیگر ہے۔ یہ وہ حرکت ہے جو نفیات کا دلچسپ موضوع بن سکتی ہے اور جس سے مرزا صاحب کی نفیات کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ لکھنے والے کی طبیعت میں گٹھیا پن ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظرف عالی نہیں اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص دماغی توازن کھو بیٹھا ہے، یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص جو رہنمائی کی پاکیزہ غرض سے آیا ہو اس کو تعصبات کے اعتبار سے ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے اس کے لئے تو یہ زیبا ہے کہ وہ بہت سمجھیدہ، بہت اونچا اور متوازن ہو، اس کی باتوں اور تحریروں

سے یہ مترشح ہونا چاہئے کہ اس کا دل و دماغ صحیح اور ٹھنڈا ہے یہ جب خوش ہوتا ہے تو منہ سے پھول جھرتے ہیں اور جب بگرتا ہے تو اس رکھ رکھا اور سایقے کے ساتھ کہ اس کے مرتبہ و مقام کو کوئی گزندہ پہنچے اور دشمن انگاروں پر لوٹنے لگے اور مرزა صاحب کی اس حرکت سے دشمن کو تکلیف تو کیا پہنچے گی البتہ وہ ان کی اس خفیف الحركتی پر النا ہے گا کہ عجب سخزے سے پالا پڑا ہے کہ جس کو گالی دینا بھی نہیں آتا گالی میں بھی اتنی جان تو ہو کہ اس کو ہزار مرتبہ دہرانا نہ پڑے۔

دو مختلف دعوے (نبوت تجدید)

انبیاء علیهم السلام کو جہاں فکر و عمل کی یعنیکروں خوبیوں سے بھرہ مند کیا جاتا ہے وہاں کھل کر اور وضاحت سے کہنے کی صلاحیت خصوصیت سے ان کو عطا ہوتی ہے۔ یعنی ان میں یہ ملکہ ہوتا ہے کہ بات ایسے انداز اور ڈھب سے کہیں کہ سننے والے کے دل میں اتر جائے اور ایک متعین اثر پیدا کرے، یعنی ان کی دعوت کی حقانیت اور سچائی میں شہبہ ہو تو سننے والے اس غلط فہمی میں ہرگز نہیں رہتے کہ یہ کہتا کیا ہے؟ زیادہ واضح اسلوب میں یوں سمجھئے کہ انبیاء علیهم السلام جب تشریف لاتے ہیں اور اپنے پیغام کو دنیا تک پہنچاتے ہیں تو وہ اپنے منصب اور دعویٰ کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ مخاطین اولین کیلئے انکار کی گنجائش تو نکل سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی دعوت کی حقیقت ہی سرے سے ان پر مشتبہ ہو جائے بالخصوص ان لوگوں پر مشتبہ ہونا تو قطعی قرین عقل نہیں جو پہلے مانے والے ہیں جنہوں نے ان کی تعلیمات کو اپنے کانوں سے سنا، کتابوں اور صحیفوں کو پڑھا اور خلوت و جلوت میں ان کے ساتھ شریک رہے۔ یہ تو بلاشبہ ہوا ہے کہ جب یہ پاکباز گروہ دنیا سے اٹھ گیا تو اس دعوت کی

مختلف تعبیریں ہونے لگیں بلکہ اس کی تعین تک میں شک و شبہ کی آندھیاں چلنے لگیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ مومنین کی صفوں میں اس کا بنیادی اختلاف رونما ہو جائے جو اصل دعوت اور منصب ہی پر پرداز ڈال دے۔ عقیدت و غلو نے بارہا ایک پیغمبر کو جو اللہ کا فرستادہ اور بندہ ہوتا ہے الوہیت کی چوٹیوں تک پہنچایا ہے مگر یہ کبھی نہیں ہوا ہے کہ اس کے ماننے والوں میں اس موضوع پر بحث چل نکلے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا یا نہیں؟ اور پھر یہ بحث بھی ایسی ہے ذہب کہ خود اس کی کتابوں سے دونوں طرح کی تائیدات ممیا ہو سکیں کیونکہ انبیاء علیم السلام سب سے پہلے جس چیز کو صفائی اور وضاحت نے پیش کرنے پر مامور ہیں وہ یہی ان کا منصب اور دعوت ہے یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیم السلام کی تاریخ میں ہمیں تین ہی طرح کے گروہ ملتے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے اللہ کا رسول مان لیا، دوسرا وہ جنہوں نے انکار کیا اور تیسرا وہ جن پر جمل اور غلو کی وجہ سے ان کی دعوت مشتبہ ہو گئی، مگر یہ واضح رہے کہ یہ گروہ مخالفین اولین اور مومنین کا نہیں ہوتا بلکہ ان میں کچھ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو براہ راست ان ذرائع تک دسترس ہی نہیں رکھتے جو حقیقت تک پہنچا سکیں اور کچھ وہ مخالف ہوتے ہیں جو دینی حقیقت کو عمداً عقیدت و محبت کے روپ میں پیش کر کے بگاڑنا چاہتے ہیں جیسے عیسائیت کے معاملہ میں ہوا کہ پولوس نے اس وقت تک حضرت مسیح علیہ السلام کی پر زور مخالفت کی جب تک وہ ان میں موجود رہے پھر جب اس نے دیکھا کہ اب میدان صاف ہے تو اپنی نبوت کا ڈھونگ رچایا اور عیسائیت کے خدو خال تک کو مسخ کر ڈالا لیکن انبیاء علیم السلام کی پوری تاریخ میں اس حقیقت کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ ایک شخص نے تو نبوت کا اوپنچا

دعویٰ کیا ہو اور اس کے ماننے والوں نے اور مخالفین اولین نے پوری دیانتداری سے اس سے کہیں کم درجے کا اسے اہل سمجھا ہو، یعنی جوش محبت اور غلو عقیدت نے انبیاء علیهم السلام کو خدا کے جہاد و جلال کا پیکر تو ٹھہرا�ا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خود ماننے والوں نے اسے نبوت کی بلندیوں سے نیچے اتار لیا ہو اور تجدید و اصلاح کی منصب پر لا بٹھایا ہو، یہ خصوصیت صرف مرزا صاحب کو حاصل ہوئی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آخر وقت تک خود ان کے ذہن میں یہ کھٹک رہی کہ نیپرانہ منصب کیا ہے، کیا میں واقعی اللہ کا نبی ہوں یا صرف تجدید و اصلاح کے منصب پر مجھے ٹرخایا جا رہا ہے؟ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب لمری آدمی تھے جب کبھی خوش فہمیوں نے زور مارا تو نبوت کے فراز اعلیٰ تک اچھل گئے اور پیغمبرانہ بلندیوں تک کو چھو آئے اور جب دماغ متوازن ہوا اور سور کی طرح اپنے پیروں پر نظر پڑی تو عاجزی کی لہر طاری ہو گئی اور آپ نے یہ کہنا شروع کیا کہ توبہ توبہ میں نے نبوت کا ادعا کب کیا ہے؟ میں تو صرف آنحضرت ﷺ کا امتی ہوں اور سوا تجدید کے اور کسی شے کا مدعی نہیں؟ سوال یہ ہے کہ جس شخص کے ذہن میں الجھاؤ ہو جو خود اپنے منصب سے متعلق یقین کے ساتھ کوئی رائے نہ رکھتا ہو اور جو بیک وقت متضاد عاوی کی رث لگاتا ہو کیا ایسا شخص ذہنوں میں کوئی سلbjھاؤ پیدا کر سکتا ہے کیا اس کے ماننے سے دماغوں میں روشنی کی کوئی کرن آسکتی ہے؟ چنانچہ مرزا ای ذہنوں میں جو ایک طرح کی پیچیدگی اور پریشانی آپ محسوس کرتے ہیں اور تناسب اور سلbjھاؤ کا فقدان پاتے ہیں تو یہ درحقیقت نتیجہ ہے اسی نمونے کا جس نے تربیت ہی ایسی پائی ہے فکر و نظر کی ٹیڑھ اور ٹولیدگی سے اب ہر مرزا ای پر اس کا یہ اثر ہے کہ استواری کے

— مرزا نیت نے زاویوں سے
ساتھ یہ کسی مسئلہ پر غور ہی نہیں کرتے۔

مجازی نبی اور ظلی نبی

مرزا صاحب کی کتابوں میں اتنا الجھاؤ، تکرار اور ذوق صحیح سے محرومی و تھی دستی کا مظاہرہ ہے کہ کوئی شخص بھی انہیں بالاستیعاب نہیں پڑھ سکتا۔ بلکہ خود ذوق صحیح کی پہچان ایک طرح سے یہ ہے کہ پڑھا لکھا آدمی اس معاملہ میں سپر ڈال دے اور اپنے بجز کا پوری طرح اعتراف کرے، یعنی سوائے ایک طرح کے مراقب اور بد ذوقی کے یہ ناممکن ہے کہ ان کی کتابوں سے شفعت پیدا ہو سکے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ بارہا ان کی کتابیں پڑھنے کا عزم کیا، بظاہر کتاب ہاتھ میں اٹھا بھی لی لیکن چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد دیکھا کہ دل و دماغ قطعی بغاوت پر آمادہ ہیں، ناچار ہمت ہار دی اور کتاب رکھ دی، صرف ایک دلچسپی البتہ ان میں ایسی ہے جو مطالعہ پر کبھی کبھی اکساتی ہے اور وہ ہے ان کا روایتی تقضاد اور بے تکاپن، ایک ہی صفحے میں بسا اوقات یہ اتنی مختلف اور متفاہد باتیں کہیں گے کہ آپ کا مخطوطہ ہونا قطعی ہے۔ زیادہ پر لطف حصہ ان کی کتابوں کا وہ ہوتا ہے جہاں یہ اپنے منصب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہاں دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک دم کتنا اوپنجا اٹھتے ہیں اور پھر کس تیزی سے زمین پر آرہے ہیں۔ کبھی تو یہ گلکان ہوتا ہے، نبوت کے تمام فرازوں کو انہوں نے آن کی آن میں طے کر لیا اور لاہوت کے کناروں کو چھو آئے اور کوئی فضیلت ایسی نہیں چھوڑی جس کا انتساب انہوں نے اپنی طرف نہ کیا ہو اور کبھی عجز و انکسار کا یہ عالم کہ ایک ادنیٰ و حیر مسلمان ہیں جن میں کوئی تعلیٰ اور ادعا نہیں۔ طبیعت کا یہ اتار چڑھاؤ پوری تحریریات میں چھلایا ہوا ہے جب نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں تو ابن مریم علیہ السلام

کو بھی خاطر میں نہیں لاتے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر منم محمد و احمد تک کا نعرہ مستانہ مارتے ہیں اور نہیں شرماتے، پھر جب اعتراضات سامنے آتے ہیں تو اپنا مقام اتنا گرا لیتے ہیں کہ انہیں دائرہ اسلامیت میں رکھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے، جھونٹا اور سچا ہونا تو خیر ایک الگ بحث ہے یہاں اصلی مصیبت یہ ہے کہ مرتضیٰ صاحب عمر بھر اس چکر سے نہیں نکلے کہ یہ کمال کھڑے ہیں؟ ان کا دعویٰ کیا ہے؟ لوگ انہیں کیا سمجھیں اور کیا جائیں، ان کا کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود یہ تضاد اور تناقض کو بڑی حکمت سے باہم سودیتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی وقت میں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ غیر تشریعی اور نعلیٰ نبی ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ مجازی نبی ہیں حالانکہ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ غیر تشریعی اور نعلیٰ نبوت کے یہ معنی ہیں کہ یہ نبوت کی ایک قسم ہے جس میں ان کے عقیدے کے مطابق دعویٰ تو ہوتا ہے۔ الہامات سے بھی نوازا جاتا ہے مگر شریعت یا پیغام نہیں ہوتا اور مجازی کے معنے اس کے بالکل الٹ ہیں، یعنی غیر حقیقی، ان دونوں میں جو فرق ہے اس کو یوں سمجھئے کہ مرتضیٰ صاحب جب اپنے کو کوئی اور غیر تشریعی نبی قرار دیتے ہیں تو وہ اپنے لئے مراتب نبوت میں سے ایک ادنیٰ مرتبہ، چن لیتے ہیں، لیکن جب وہ کہتے ہیں کہ ان کی نبوت مجازی ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ سرے سے منصب نبوت پر فائز ہی نہیں اور ان کو جو نبی کہا جاتا ہے تو وہ محض ایک پیرا یہ بیان ہے جیسے کوئی شخص اپنے گدھے کو ازراہ محبت اسپ تازی کہہ دے یا اسپ تازی کو شیر قرار دے تو اس سے اس کی حقیقت نہیں بدلتے گی۔ گدھا، گدھا ہی رہے گا اور گھوڑا گھوڑی ہی، گویا غیر تشریعی نبی اور تشریعی نبی میں فرق مرتبہ کا ہے اور مجازی نبی اور نبی میں فرق نوعیت کا ہے

لیکن مرزا صاحب کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ان دونوں کو اس طرح اپنے میں جمع کر لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا یہی الجھاؤ لاہوری و قادریانی تفریق کا ذمہ دار ہے۔ تجب ان پر نہیں یہ تو بے چارے اپنی افتاد طبیعت سے بہر آئینہ مجبور تھے، تجب ان لوگوں پر ہے جو اس زمانے میں ان کو مانتے ہیں، آج دور صاف صاف اور دوٹوک بات کہنے کا ہے، یعنی یا تو آپ کا ایک معین منصب ہے اور یا نہیں ہے۔ یہ پیچ دار باتیں اور چنان چنیں کے قصے اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس عمد میں ذہن و فکر کی مشغولیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ایسا الجھا ہوا انسان قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتا، ذہنی خوبیاں ہی تو ایک ایسی چیز ہیں جن کی بناء پر ایک پیغمبر اپنے ہم عصروں سے ممتاز ہوتا ہے اور اگر اسی نعمت سے یہ حضرت محروم ہیں اور ذہن ہی میں استواری اور استقامت نہیں تو دعویٰ نبوت کس برتبے پر، ہمارے نزدیک نبوت فکری ارتقاء اور فکری سلجنچاؤ کا آخری مقام ہوتا ہے اور جس کو ہم نبی قرار دیتے ہیں اس کے متعلق یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ وہ بسترین صلاحیتوں سے بہرہ مند ہے۔

نبوت اور ذوقِ شعری۔

مناظرہ بازی کو ہم ابتداء ہی سے صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ یہ کسی اعتبار سے بھی مفید نہیں بعض وقتی فوائد جو اس سے حاصل ہوتے ہیں ان میں مضرت و نقصان کے کئی عظیم پہلو پہلا ہوتے ہیں جو بادی انظر میں گود کھائی نہیں دیتے مگر تھوڑے سے غورو فکر کے بعد ان کا سراغ لگایا کچھ بھی دشوار نہیں۔ مناظرہ بازی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے ایک مخصوص دفاعی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اور انسان دین کے مسائل میں غور و فکر کا ہمیشہ ایک ایسا انداز اختیار کرتا ہے جس پر دوسرے

کمپ سے لوگ اعتراض نہ کر سکیں۔ رہی بات کہ اس میں حقیقت کی جھلک بھی ہوتی ہے یا نہیں تو اس کی اس کو چند اس پرواہ نہیں ہوتی۔

مناظرانہ تفسیروں میں شرعاً و تفصیل کے مختلف گوشوں سے تعریض کرتے وقت یہ خطرہ ہر ایک کے پیش نظر رہتا ہے کہ جو بات بطور تاویل و تعبیر کے اختیار کی جا رہی ہے اس سے مخالفین تو کوئی استفادہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ قادیانی تفسیر کا یہی مخصوص ذہب ہے جو قطعی غلط ہے۔ ان کے ذہنوں پر ہر وقت آریہ سماجی، عیسائی مشنری اور مستشرقین سوار رہتے ہیں اور یہ ان کی اعتراضات کی روشنی میں قرآن کے عقدوں کو سلب چھاتے ہیں۔ ہمارا یہ وظیرہ نہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بجائے خود ایک ثابت حقیقت ہے اور اس لائق ہے کہ اس کے مطالب کی توضیح کرتے وقت صرف یہی سامنے رہنا چاہئے۔ اس کے مزاج، حدوہ ادبی، لغوی نمائشوں کو ملاحظہ کھا جائے اور محض یہ دیکھا جائے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؐ نے ان مطالب پر اپنے قول و عمل سے کیونکر روشنی ڈالی ہے۔ جب اس طریق سے قرآن کی کسی آیت کا مطلب واضح ہو جائے تو ہم اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس پر کس کس کمپ کی طرف سے کیا کیا اعتراض وارد ہوتا ہے، کون کون لوگ اس سے کیا کیا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کا جواب دینا یقیناً ہمارے فرائض میں داخل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اعتراض کو اتنا وزن دیا جائے کہ تعبیر و تاویل کی قدرتی سختیں ہی بدلتیں اور معنی حقیقت میں اور اعتراض کے پیش نظر اپنا موقوف ہی چھوڑ دیں اور مصنوعی اور غیر استوار مورچوں پر آرہیں۔ اسی طرح اس احتیاط کو ہم بے وقوفی سمجھتے ہیں کہ ہماری تاویل سے کوئی ملحد اپنے مطلب کی چیز نہ نکال سکے۔ ہماری رائے میں بات صحیح کہنا شرط ہے اگر کوئی شخص اس صحیح بات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی

ذمہ داری کہنے والے پہلیں خود اس پر اور اس کے غلط انداز فکر پر عائد ہوتی۔
اس تمهید کے بعد اصل قصہ سنئے!

الاعتصام 9 فروری 1951ء کی اشاعت میں ہم نے تفسیر کے کام میں اس موضوع پر بحث کی ہے کہ قرآن کن معنوں میں ”مجزہ“ ہے۔ اس ضمنی سوال پر بھی روشنی ڈالی تھی کہ کیا قرآن تفسیر ہے اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ مکہ والے باوجود اس کے کہ اچھا خاصاً ذوق شعر رکھتے تھے اور نظم و نثر کے فرق کو بخوبی سمجھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ پوچیگندہ کرتے تھے کہ یہ شاعر ہیں، یہ ظاہر ہے کہ شاعر سے مراد یہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ قرآن فی الحقيقة ایسا کلام ہے جس پر شعر کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں بتایا تھا کہ اگرچہ قرآن حکیم بلا اختلاف نظر ہی میں ہے۔ تاہم اس میں شعر کی وہ تمام کیفیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں جو شعر کو شعر کا درجہ بخشتی ہیں۔ یعنی وہی ترجم ہے، وہی تناسب ہے، وہی زیر و بم ہے، وہی الفاظ و حروف کی موزونیتیں ہیں، مگر اس کے باوجود جب صاحب قرآن کو شاعر کہا تو اس سے ان کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ جس طرح شعراً غیر حقيقی خیالات سے کلام کی رونق و عمدگی کا سامان مہیا کرتے ہیں اسی طرح قرآن بھی ایک طرح کی غیر حقيقی بلند پروازی ہے۔

اعتراض کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر قرآن حکیم نے اس الزام کی تردید کی۔

وَمَا عَلِمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ (یسین: ۶۹)

”اور نہیں سکھایا ہم نے اس کو شعر اور نہ ہی شاعری اس کے لائق ہے۔“

کہ کذب و اخلاق کی یہ نوعیت جسے تم شعر کہتے ہو یا شاعری سے تعبیر کرتے ہو اس کی ہم نے تعلیم نہیں دی اور نہ انبیاء علیہم السلام کو یہ زیب ہی دیتا ہے کہ وہ حقاً لائق کو

چھوڑ کر خیالات و اوهام کی وادیوں میں بھکتے پھریں۔ ان کا کام تو یہ ہے کہ زندگی کی سچائیوں کا سامنا کریں اور انسان کو ان سچائیوں کے بارے میں صحیح صحیح معلومات بھم پہنچائیں جو ان کی دنیا و عقليٰ پرا شر انداز ہو سکتی ہیں۔

اس وضاحت سے مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری جامعہ احمدیہ کے پرنسپل ہیں بہت خوش ہوئے ہیں کہ لیجئے، مرزا صاحب پر جو یہ اعتراض چلا آ رہا تھا کہ اگر وہ پیغمبر ہیں تو انہوں نے شعر گوئی کو تبلیغ کا ذریعہ کیوں ٹھہرایا، رفع ہوا۔ حالانکہ ہمارا یہ اعتراض ہی ان پر سرے سے نہیں ہے کہ ان کے کلام میں شعرو ادب میں پاکیزہ نمونے کیوں نہیں ملتے، ہمارا تو اعتراض اس کے برخلاف یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہو کر ذوق ادب سے اس درجہ محروم کیوں ہیں؟ ان کی نشر کیوں اتنی پھیکلی، بے جان اور ادبی نکھار سے عاری ہے اور ان کے اشعار کا یہ عالم کیوں ہے کہ ان میں ”تابندھے ازار“ ایسے درمیشیں کی جھلک ہے۔ یا ”ہوں بشر کی جائے نفرت“ ایسی ترکیبیں کیوں پائی جاتی ہیں، جب کہ ان سے صاف طور پر ذم کے پہلو کا اظہار ہوتا ہے۔

مرزا نیت کی تردید میں، ذوق ادب کو ہم اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ دوسرا کوئی چیز اس درجہ مؤثر نہیں ہمارے نزدیک یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک عربی پڑھا ہوا مولوی مرزا نیت کو قبول کرے مگر یہ ناممکن ہے کہ باذوق ادیب مرزا صاحب کی کتابوں سے متاثر ہو سکے کیونکہ ذوق کا فیصلہ دوٹک ہوتا ہے، اس کے سامنے علم کی طرح ماننے یا نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے سامنے یہ سوال ہوتا ہے کہ کوئی انداز تحریر کس حد تک اس کے حصے جمالیات کو بیدار کرتا ہے۔ دلیل بھٹک سکتی ہے، استدلال کا فیصلہ غلط ہو سکتا ہے، مگر ذوق کبھی دھوکہ نہیں کھاتا۔ ہزار دلائل ایک طرف صرف ایک دلیل ان سب پر حاوی اور مرزا نیت کے کذب پر بہان

ساطع ہے کہ یہاں نبوت کے ساتھ ادب و ذوق کی وہ بخششیں کیوں موجود نہیں جو نبوت و رسالت کو مستلزم ہیں۔

”جھوٹا نبی اور سچا نبی“

دونوں میں فرق کی نوعیت کیا ہے؟

مرزا صاحب کے متعلق ایک عام غلطی یہ ہے کہ یہ مانا کہ انہیں نبوت کا مرتبہ حاصل نہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبوت کی بلندیوں تک ان کی رسائی نہ ہو پاتی ہو مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ سرے سے نیکی اور تقویٰ کے کسی درجہ کا اہل ہی انہیں نہ سمجھا جائے۔

یعنی اگر ایک شخص شمس العلماء یا مسح الملک نہیں ہو سکا تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ جید عالم یا اچھا خاصا طبیب بھی نہ ہو، زیادہ وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ اگر ایک فاضل محقق (ڈاکٹریٹ) کی سند نہیں پاس کا تو اتنا تو بہرآئے مانا ہی پڑے گا کہ اس کا علمی پائیے ضرور بلند ہے۔

نبوت چونکہ صلاح و تقویٰ سے بہت آگے کا ایک مقام ہے اس لئے اگر کسی شخص سے متعلق جھگڑے اور بحث کی نوعیت یہ ہو کہ آیا وہ نبی ہے یا نہیں ہے؟ تو ظاہر ہے کہ یہ اعتراف فریقین میں قدر مشترک کی حیثیت رکھے گا کہ کم از کم اس کی ولایت و خدا پرستی میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

اس غلط فہمی کا سبب کئی منطقی مغالطے ہیں پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اس میں نبوت کو بھی اسی طرح کی اکتسابی شے قرار دیا گیا ہے جس طرح کے علوم و فنون یا محاسن اعمال کے یہ دونوں طرح کی چیزیں کسب و مخت نے حاصل ہوتی ہیں حالانکہ نبوت اللہ کی ایک مخصوص بخشش اور متعین دین کا نام ہے۔

دوسرامغالطہ اسی سے ملتا جلتا یہ ہے کہ نبوت کو ایک الگ حقیقت اور منفرد
شے فرار دینے کے بجائے یہ سمجھا جائے کہ محاسنِ اعمال یا تقویٰ کی مخصوص رفتار ہے
جس کا ایک ارتقاء ہے اور اس رفتار اور ارتقاء کا ایک اٹیشن یا ٹھہراؤ نبوت ہے، لہذا
جب تک عقیدہ و عمل کی گاڑی پاک بازی و حسنِ عمل کے چھوٹے چھوٹے اٹیشنوں
سے آگئے نہیں بڑھ جاتی اس وقت تک اس بڑے اٹیشن تک نہیں پہنچتی۔

تیرا بہلا وہ اس میں یہ ہے کہ ہم نبوت کو اس ڈھنگ کی چیز سمجھتے ہیں کہ اس
کا صحیح یا غلط ہونا عقیدہ و عمل کے کسی گوشہ پر اثر انداز نہیں ہوتا حالانکہ یہی غلط ہے۔
نبوت اگر صحیح ہے تو سرمایہ صدر حمت و برکت ہے اور اگر غلط ہے تو اس سے بڑھ کر اور
کوئی گمراہی اور ضلالت نہیں ہو سکتی۔

نبوت کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ تو مشکل ہے، تین موئی موئی علامتیں البتہ ایسی ہیں
جن پر یہاں غور کر لینا چاہئے اور وہ ہیں صدق خیال، صدقِ مقال اور صدقِ اعمال۔
★ صدق خیال سے یہ مراد ہے کہ ایک شخص جب یہ کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا
نبی ہوں تو فی الواقع اللہ نے اسے اس منصب پر فائز فرمایا ہے اور وہ اس پر یقین رکھتا
ہے۔ ایسا ہی محکم اور اُنیل یقین جیسے یہ کہ آفتاب ہر روز چلتا ہے، چاند مقررہ دنوں
میں ہلال سے بدرا ہوتا ہے اور بدرا سے ہلال۔

★ صدقِ مقال کے یہ معنی ہیں کہ جس سچائی کو نبی جانتا ہے، جس کی تبلیغ و
اشاعت پر وہ مامور ہے اسے کسی ترغیب و ترہیب سے متاثر ہوئے بغیر بلا کم و کاست
دوسروں تک پہنچائے، نہ چاندی اور سونے کے انبار اسے کتمانِ حق پر مجبور کر سکیں اور
نہ حکومت و اقتدار کا چادو ہی ایسا ہو کہ اس کی زبان کو سچائی و خودداری کی جانب سے ہٹا
کر مدح و ستائش اور خوشنام و تملق کی رذالتوں کی طرف پھیر دے۔ صدقِ مقال کا یہ

تفاضا ہے کہ وہ چلتی تلوار اور دبکتی ہوئی آگ کو دیکھ کر بھی توحید سے دستبردار نہ ہو۔

☆ صدق اعمال یہ ہے کہ جس پیغام کا یہ مدعی نبوت حامل ہواں پر خود عمل پیرا بھی ہو۔

اب اگر ایک شخص اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ اللہ نے اس کو بھیجا ہے یا اللہ کی بخشش و موبہبت نے اسے مامور ٹھہرایا ہے تو وہ ان تینوں خوبیوں سے محروم ہو گا اس کے عقیدہ و خیال کے تلوں کا یہ عالم ہو گا کہ کبھی خدائی کے خواب دیکھے گا، کبھی نبوت کا ذہونگ رچائے گا اور کبھی تجدید کی سیڑھیوں تک نیچے اتر آئے گا۔

☆ صدق مقال و اعمال کی یہ کیفیت نہ ہو گی کہ معمولی گرفت پر نبوت سے دستکش ہو جائے گا اور یہ تحریر دے کر عدالت سے پیچھا چھڑائے گا کہ میں نبوت و ماموریت کے ان گوشوں کا اظہار نہ کروں گا جو وعیدی ہوں جن میں یہ مذکور ہو کہ فلاں شخص ہلاک ہو جائے گا یا مر جائیگا۔

گویا نبوت اور دعویٰ نبوت کے بعد عدم نبوت کی صورت میں جو فرق ہے وہ اس ذہب کا ہے کہ اس میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے کیونکہ یا تو ایک شخص فی الواقع اللہ کا پیارا اور محبوب ہے اور فی الحقيقة اللہ تعالیٰ نے اسے اس خدمت کے لئے چنا ہے اور یا پھر اسے شیطان نے بہکایا اور گمراہ کیا ہے۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔

جھوٹا نبی نہ صرف یہ کہ اپنے ادعاء میں غیر صادق ہے بلکہ پر لے درجہ کا گمراہ اور جعل ساز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس کو سب سے بڑے ظلم سے تعییر فرمایا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ (الصف: ۷)

اور اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔

نبوت و رسالت سے متعلق ہی ایک خیال توجہ مرت تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان زور و باطل میں ایسے حق آگاہ حضرات کو بھی پیدا کیا ہے جن کی زندگیاں سچائی کے بڑے بڑے معیاروں پر بھی پوری اترتی ہیں جو نفس کی خواہشات سے الگ ہو کر ماحول کی ترغیبات سے قطع نظر کر کے اور نظام باطل کی کڑی آزمائشوں سے بے نیاز ہو کر خدا کے بول کو بالا کر سکتے ہیں۔ اب اگر انہیں میں ایسے لوگ آمیں جن پر شہوت کا غالبہ ہے جو ماحول کی غلامی میں جکڑے اور بند ہے ہونے ہیں اور جو سطوت و اقتدار سے اس درجہ خائن و متأثر ہیں کہ نصوص تک پرخط تنسخ پھیر سکتے ہیں جن کا تبلیغی داعیہ صرف کتاب فروٹی اور مناظرہ بازی تک محدود رہے تو ظاہر ہے کہ ان کے اس خیال و تصور کو کتنی شخصیں لگے گی اور حق و صداقت کے ان معیاروں کی نسبت کتنا گھٹیا عقیدہ قائم ہو گا۔

نیکی نہ کرنا اور تقویٰ کے کسی درجہ سے محروم رہنا اگرچہ ایک طرح کی بدختی ہے مگر تقویٰ کے بلند معیاروں کی تو ہیں کرنا اور کردار و سیرت کے اوپر نمونوں کی نسبت سوءظن پیدا کرنا اتنا بڑا جرم اور بدختی ہے کہ ہرگز درخور عفو نہیں۔ لہذا جھوٹا نبی صرف اتنا ہی نہیں کہ جھوٹا ہوتا ہے بلکہ گراہی و بے دینی کا سب سے بڑا منبع اور مرکز ہوتا ہے۔ اس سے مذہب کے اوپر خیالات کو جتنا نقصان پہنچتا ہے اور کسی سے نہیں۔

سخن فہمی عالمِ بالامعلوم شد

مرزا صاحب کے شلف اور گوناناؤں دعووں میں ایک یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فہم و تفسیر کے دروازے ان پر کھول دیئے ہیں۔ اور معارف و نکات قرآنی کا جو

بہرہ و ران کو ملا ہے اس میں دوسروں کا کوئی ان کا سامنہ نہیں۔ اے کاش! یہی بات صحیح ہوتی کیونکہ ان کے آنے سے بجز اس کے کہ مسلمانوں میں انتشار پھیلا ہے، بد ذاتی بڑھی ہے اور انگریز کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا ملا ہے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اگر واقعی انہوں نے قرآن کے ان دونوں کے درمیان کے سمندر میں جسے فتنہ سے تعبیر کیا جاتا ہے شناوری کی ہوتی اور اس بحرذخار کی ایک ہلکی سی موج ہی دیکھی ہوتی تو ان کی بصیرت جھوٹی نبوت کے ڈھونگ رچانے سے اس کو کہیں بہتر قرار دیتی کہ قرآن حکیم کے معانی و مضرات کے انکشاف و تفصیل پر عمر صرف کر دی جائے۔ کیونکہ اس غواصی اور ڈھونڈ میں جو موتوی بھی ہاتھ آجائے وہ اتنا قیمتی اور گرانقدر ہے کہ اس پر بجا طور پر ان کو ناز ہو سکتا ہے۔ مگر اس کام کیلئے جس صلاحیت، جس دماغی استعداد اور سلیقہ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تقویٰ و پاکبازی کی ضرورت ہے مرزا صاحب اس سے یکسر تھی اور کوئے تھے۔ بالکل اسی ڈھنگ کا دعویٰ اکثر میاں محمود نے بھی کیا۔ حالانکہ اگر ان باپ بیٹا نے معانی و نکات کے نام سے جو کچھ لکھا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے اور ان کو طول بیانی یا مراقب و ادعاء سے الگ کر کے دیکھا جائے تو جو خلاصہ رہ جائے گا وہ دو حال سے خالی نہیں ہو گا یا تو وہ نئے اور جدید نکات و معانی سے تعبیر ہو گا جس میں سو اجadt کے اور کوئی خوبی نہیں ہو گی اور یا پھر وہی باتیں ہوں گی جو سب نے کہی ہیں۔ تیری کوئی صورت متصور نہیں۔ جہاں تک قرآن حکیم کے وجوہ محتمله کا تعلق ہے سلف نے ہمارے لئے وہ عظیم تر کہ چھوڑا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس میں کسی نئے نکتہ کے اضافہ کی گنجائش ہی نہیں۔ ہاں سیاق و سبق آیات سے البتہ نئے نئے معانی کا استنباط ہو سکتا ہے لیکن اس فن سے یہ باپ بیٹا دونوں نا آشنا ہیں اور یا پھر ان علوم و احوال سے متعلق کچھ کہنا ناممکن ہے۔ اجمالاً قرآن حکیم نے جن کی نشاندہی کی

ہے اور آج ان کی تصدیق ہو رہی ہے اس پہلو سے بھی افسوس یہ ہے کہ مرزا نیت کی کوشش طفلا نہ اور مضمون خیز ہے اور تو اور مرزا نیت کو وہ زبان اور پیرا یہ بیان ہی نہیں ملا جو اعلیٰ دینی مضامین کے شایان شان ہو۔

29 مارچ 51ء کے افضل میں میاں محمود کا ایک کشف شائع ہوا جس میں لفظ رب العالمین کی تصریح کی گئی ہے کہ ”وَهُرَبْ صِرْفَ اسی معنوں پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ پیدا کرنے والا ہے بلکہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی مناسب طور پر اس کی باریک درباریک قوتوں اور طاقتیوں کو درجہ بدرجہ اور مناسب حال ترقی دیتا چلا جاتا ہے اور عالمین کا لفظ محض زمین و آسمان پر دلالت نہیں کرتا بلکہ زمین و آسمان کے علاوہ مختلف اجناس کی مختلف کیفیتوں پر بھی دلالت کرتا ہے اور یہ مضمون پہلی کتب میں بالکل بیان نہیں ہوا“۔ یہ الفاظ میاں صاحب کی ایک تقریر کا حصہ ہیں جو انہوں نے عالم رویا میں فرمائی۔ اس کے بعد اس نکتے سے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ”فِي الواقع ایک نیا نقطہ نگاہ ہے جس کے ذریعہ سے رب العالمین کی آیت کی تفسیر ایک نئے رنگ میں اور نئے اسلوب سے کی جاسکتی ہے جو نہایت بصیرت افروز اور علم پیدا کرنے والی ہوگی“۔ یہ نیا نقطہ نگاہ جس کو بیان کرنے کیلئے میاں محمود نے کشف و رویا کی آڑی کس درجہ عام و شائع و ذاتی ہے اس کی تحقیق کے لئے بڑی بڑی کتب تفسیر کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں صرف راغب کی مفردات اٹھا کر دیکھ لی جائے کہ اس میں لفظ رب اور عالمین کے تحت کیا لکھا ہے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ ان کے دعووں میں سچائی کی مقدار کتنی ہے، رب سے متعلق ان کی تصریح ہے کہ الر ب فی الاصل التربیة و هو انشاء الشئ حالا فحالا الی حد التمام یعنی رب کے معنی درحقیقت تربیت کے ہیں اور تربیت یہ ہے کہ ایک شے کی تکمیل و اتمام کی جود ریاضی

منزیلیں ہیں ان سب کی دیکھ بھال یا نگرانی کرنا اس لئے رب وہ ذات ستودہ صفات ہو گی جو ہر بر شے کے تمام مضررات مخفیہ کو وجود میں لا تی ہے اور تمام و کمال تک پہنچاتی ہے۔ عالم کی تفسیر میں ان کا کہنا ہے والعالم اسم للفلك و ما يحويه من الجوادر والاعراض كـ عالم آسمان اور اعراض وجواہر سے جن جن هنائق کو وہ گھیرے ہوئے ہے سب کے مجموعہ کا نام ہے۔ عالم بصورت جمع کیوں ہے اس کے جواب میں فرماتے ہیں فلاں من کل نوع من هذه قدیسمی عالما کہ کائنات کی ہر ہر نوع اور صنف کو چونکہ عالم کہا جاتا ہے اس لئے اس نوع و کثرت کی رعایت سے عالمین فرمایا۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لئے کہ عالمین سے مراد صرف انسان یا جن و ملائکہ ہی نہیں بلکہ کائنات کا ہر ہر ظہور ہے۔ ایک روایت بھی لائے ہیں جس میں کھلے بندوں کہا گیا ہے کہ ان اللہ بضعة عشر الف عالم کہ اللہ تعالیٰ کے بزاروں عالم ہیں جن کی وہ ربوبیت فرماتا ہے۔

ان تصریحات پر غور فرمائیے اور بتائیے کہ خلیفہ صاحب نے جسے نیا نقطہ قرار دیا ہے اور جس کو کشف و روایا میں معلوم کیا ہے اس میں کیا اچھا بھاپن ہے اور کیا جدت ہے۔ اسی پر سلسلہ مرزا نیہ کی تمام لنڑائیوں کو قیاس کر لیجئے۔ اس قسم کی باتیں جاہل مریدوں اور جاہل مولویوں، فاضلوں میں بیٹھ کر سنائی جا سکتی ہیں۔ لیکن انہیں کوئی شخص بھی جس کے کندھوں پر سر ہے اور سر میں بھیجا ہے حقیقت قرار نہیں دے سکتا۔ تعجب مولوی روشن دین تنور یہ پر ہے کہ وہ بھی اس کشف اور روایا کی اشاعت پر مجبور ہے حالانکہ اس کا دل خوب جانتا ہے کہ یہ زمانہ اس طرح کی ڈینگیں مارنے کا نہیں ہے۔ ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ جماعت مرزا نیہ کے پڑھے لکھے لوگوں

سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مرزا صاحب یا میاں محمود کا سارا لشیخ پر کھنگال کر کوئی تفسیری نکتہ ایسا منظر عام پر لا جائیں جو بشرط صحت نیا ہو اور جو پہلوں کو ناسوجھا ہوا اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو یقیناً نہیں کر سکتے تو پھر اللہ سے ذریس اور اس فریب وادعاء سے باہر نکلیں۔

اور یہ روایا.....

خواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کے کئی جواب دیئے جا سکتے ہیں بہت سادہ اور اکثر حالات میں صحیح صحیح جواب یہ ہے کہ یہ ذہن کا ایک قدرتی فعل ہے غیر متعاد حالات میں۔ یعنی اس کے سوچنے کا عام اور قدرتی ذہنگ یہ ہے کہ یہ بیداری اور جسم کی مشینری کے ساتھ اس کا تعلق یا لگاؤ اپنی طبعی اور معتدل حالات میں قائم ہو لیکن اگر یہ نیند میں ہو یا کسی اور سبب سے اس کا ناط جسمانی مشینری سے بظاہر منقطع ہو جائے تب بھی یہ کام برابر کرتا رہتا ہے اور غور و فکر کے اندوختے کو پھیلاتا اور سمجھتا رہتا ہے۔ ان حالات میں یہ دنیا کا عجیب نقشہ کھینچتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس دنیا سے بالکل مختلف دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ اس میں کئی آفات، موجود دنیا کے آفات سے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں کے مکانیات دنیا کے مکانیات سے تو گویا کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتے۔ یہاں ہو سکتا ہے کہ ایک منٹ پھیل کر سال بھر کی وسعتوں پر چھا جائے اور سال بھر کی وسعتیں چند لمحوں میں سمٹ آئیں۔ اسی طرح یہاں کی زمین ایک جست لگا کر آسمان کو چھو سکتی ہے اور آسمان اتنا جھک سکتا ہے کہ قاب قوسین سے بھی کم فاصلہ رہ جائے۔ خواب کی یہ تعبیر مختلف فیہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اس سے زیادہ کا بھی حامل ہے جس طرح بیداری میں روح انسانی کی یہ

صلاحیت تنازعہ فیہ ہے کہ آیا اس کاملاً اعلیٰ سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ اور نبوت کا کوئی منطقی امکان موجود ہے۔ اسی طرح یا مر جھگڑے کا ہے کہ آیا ذہن کے اس فعل سے پیشین گوئی کا تاریخ پود بنا جاسکتا ہے اور اس سے مستقبل کے متعلق کوئی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے؟ مادی مادی چیز کو مادی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں حتیٰ کہ خود ذہن کے غور و فکر کو بھی مادی ہی قرار دیتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ خواب میں کسی نئی حقیقت کا اظہار ہرگز نہیں ہو پاتا بلکہ دراصل اس میں خواہشات و آرزوؤں کا پرتو ہوتا ہے۔ جن کو ہم عالم بیداری میں غور و فکر کا جز ٹھہراتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ عالم بیداری میں ہم ان کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو عالم خواب میں ذہن عطا کرتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھتے کہ خواب ان دلی اور کچلی ہوئی آرزوؤں کا آئندہ دار ہوتا ہے جنہیں بیداری میں اظہار ووضاحت کے لئے مناسب اسلوب یا موقع نہیں ملتا۔

وہ لوگ جو مادہ کے علاوہ روح کو بھی ایک مستقل بالذات وجود قرار دیتے ہیں رائے رکھتے ہیں کہ بیداری میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی عنایت سے قلب مہبط وحی بن جاتا ہے خواب میں بھی اسی طرح اس پر افاضہ انوار ممکن ہے اس کا اصطلاح میں ”رویاء“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فی الحقيقة روح ہی کی ایک غیر معمولی جست کا دوسرا نام ہو لیکن اس میں بھی بہر آئندہ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ علوم آلهیہ کی ایک تجھی ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فاسق و فاجر کے قلب پر بھی بعض مناسبوں کی رعایت سے اس کا ظہور ہو جائے مگر ایسا ہونا نادر الوقوع ہے۔ کثرت سے ایسے خواب دیکھنا جو پورے ہو جائیں ایک خاص صفت ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو نوازا جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جسے نبوت کا جزو قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ لم یبق من النبوة الا

المبشرات یعنی نبوت کے کواڑ تو بند کر دیئے گئے اب جو کچھ رہ گیا ہے وہ اس کا ایک حصہ ہے جسے مبشرات کہہ لیجئے۔ جب یہ حقیقت سمجھ لی گئی کہ سچا خواب ایک طرح کا افاضہ ہے اور اللہ کی بخشش ہے اور اس میں آئندہ واقعات کو ایک خاص ڈھنگ سے بیان کیا جاتا ہے تو یہ معلوم کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ خواب کی حیثیت دراصل ایک پیرا یہ بیان کی ہوتی ہے۔ یعنی بیداری میں جو افاضہ کی شکل ہے اسے ہم الہام و وحی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں اللہ کی تجلی، "علم"، الفاظ و حروف میں ظاہر ہوتی ہے اور خواب میں حقیقت کا اظہار ایسے ڈھنگ سے ہوتا ہے جس میں الفاظ و حروف کی پابندی بالکل نہیں ہوتی بلکہ یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آتا ہے جو تعبیر طلب ہوتا ہے اور جس کے تاویل روایاء کے اعتبار سے کچھ معنی ہوتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ تاویل روایاء کی حیثیت فن کی نہیں ذوق کی ہے۔ لہذا اس کے لئے بچے تک قواعد نہیں ہو سکتے جس طرح سچا خواب پا کیزہ دلوں میں اپنا نشیمن بناتا ہے اسی طرح اس کے مطالب کا علم بھی ہر شخص کو نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے لئے بھی مخصوص ذہنوں کو چنا جاتا ہے یہی وہ بات ہے جس کو سورہ یوسف میں یوں ادا کیا گیا ہے وَ يَعْلَمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيْثِ كَمَا اللَّهُ تَعَالَى تَعْلَمُ بِهِ تعبیر روایاء کا ذوق خاص بھی مرحمت فرمائیں گے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ روایاء ایک طرح کا پیرا یہ بیان ہے تو اس کا بدرجہ غایت پا کیزہ ہونا ضروری ٹھہرا۔ یعنی جس طرح قرآن میں یہ المرام ہے کہ نازک سے نازک جنسی مسائل کو بیان کیا جائے لیکن کہیں بھی ایسا ڈھب اختیار نہ کیا جائے جس سے ذوق صحیح مجرور ہو۔ اسی طرح یہ پرایہ بیان جو روایاء کی شکل میں ہوتا ہے اور خاص افاضہ، انوار ہے جس میں ملاء اعلیٰ کی دخل اندازوں کی جھلک ہوتی ہے جس

میں مستقبل کی خبریں ہوتی ہیں اور آئندہ کے واقعات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا پاکیزہ، ایسا عمدہ اور نفیس ہونا چاہئے کہ ذوق پرگاراں نہ بوا اور طبیعت کو سن کر اس سے تغصہ نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس سے ایک طرح کا اشرح ہونا چاہئے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ایک بہت بڑے مدعیٰ کشف کا ایک روایاء ناک پر رومال رکھ کر پڑھ جائیے اور پھر بتائیے کہ طبیعت کا کیا حال ہے؟
ہیڈنگ یہ ہے ”حضرت امیر المؤمنین خلیفہ اُسحَّ الشَّانِ ایمہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے چند تازہ روایاء و کشوف روایاء یہ ہے۔

”میں نے دیکھا کہ میں ایک جگہ قضاۓ حاجت کے لئے بیٹھا ہوں اور بڑی مقدار میں پاخانہ آیا ہے یہ روایاء میں نے دو دفعہ دیکھی ہے۔“

تعییر یہ ہے ”میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جلد یا بدیر کوئی صورت بقیہ جانیدادوں کے فروخت کی یا ان کی آمد میں بڑھوتی کی ایسی پیدا کردے گا جس سے لوگوں کے قرضے آسانی سے ادا ہو سکیں گے۔“ (الفصل 22 نومبر 50ء)

کہنےے اس مطلب کے لئے اس سے بہتر پیرا یہ بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر یہ صرف خواب ہی رہتا تو ظاہر ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ خواب اس سے بھی بے ہودہ ہو سکتا ہے، لیکن روایاء کشف کا یہ پیرا یہ بیان اتنا گھنا و نا ہو، کیا یہ روایاء کشف کی توہین نہیں ہے۔ اور ملاعہ اعلیٰ کے ذوق پر براہ راست حملہ نہیں ہے۔؟

آیت تقول کی صحیح تفسیر

إِنَّهُ لِقَوْلِ رَسُولِ كَرِيمٍ ○ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ○ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ○ تَنْزِيلٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ وَلَوْ تَقُولَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلَ ○ لَا خَدَنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ○ فَمَا مِنْكُمْ مَنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ○

(الحافقة ٤٧ تا ٤٠)

” یہ تو معجزہ فرشتے کالایا ہوا کلام ہے۔ شاعر کی بنائی ہوئی بات نہیں مگر تم ہو کہ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ کاہنوں کی تک بندی بھی نہیں مگر تم ہو کہ عبرت پذیر نہیں ہوتے۔ یہ تو پروردگارِ عالم کی طرف سے اتری ہوئی اور آئی ہوئی دعوت ہے۔ اگر یہ پیغمبر (آنحضرت ﷺ) اپنی گھڑنت کو ہماری طرف منسوب کرنا شروع کر دیں تو ہم ان کا داہمنا تھا کچھ پکڑ لیں اور گریت کاٹ دیں۔ پھر تم میں کوئی بھی ان کو ہماری گرفت سے روکنے والا نہ ہو۔ ”

بات صاف ہے اللہ تعالیٰ کو آنحضرت ﷺ کی سچائی اور صداقت کا اظہار کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ ان سے یہ توقع نہ کرو کہ یہ تمہاری خوشنودی کیلئے ہماری ناراضی کا خطرہ مول لیں گے۔ یہ قرب و معرفت کے اس بلند مقام پر فائز ہیں جہاں اس ذہب کی لغزش کے معنی شدید ترین سزا کے مستوجب ہونے کے ہیں۔ یہ شاعر انہ تعليٰ نہیں کہ اس پر توجہ نہ دی جائے، نہ ہی کاہنوں اور رمالوں کی تک بندیاں ہیں کہ درخور اعتنا نہ ہوں۔ یہ تو اللہ کی طرف سے اتر اہوا کلام ہے جس میں آمیزش و تحریف کے اختیارات نبی کو ہرگز نہیں۔ اس لئے تم جو اس امید اور آس پر تکیہ کئے بیٹھے ہو ایک نہ ایک دن یہ تمہارے ذہب پر آ، ہی جائیں گے اور توحید و رسالت کی نکھری ہوئی دعوت کو شرک و بت پرستی سے ملوث کر دیں گے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ ہمارے ہاں نبوت کی ان بلندیوں پر ممکن ہو کر پھسلنے اور گرنے کی سزا بڑی ہو لنا کہ ہے۔ اگر اپنا محال، ممکن کا لباس پہن بھی لے یعنی ہمارا فرستادہ ہو کر ہم ہی پر افترا کرنے لگیں تو پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ زندگی کے بارہی سے سبکدوش

ہو جائیں اور کوئی تدیران کو اللہ کی گرفت سے نہ بچا سکے۔

سزا سے متعلق اللہ تعالیٰ کی یہ عام سنت ہے کہ وہ ڈھیل دیتا ہے اور مجرم کو موقع عطا فرماتا ہے کہ موت سے پہلے پہلے اپنی حرکتوں پر نادم و منفعل ہو سکے اور اس کے باپ اجابت پر دستک دے سکے یا پھر اس کی سرکشی حد سے بڑھ جائے اور گناہ اسے چاروں طرف سے گھیر لیں تاکہ قیامت کے دن جہنم کے عذاب سے دوچار ہو سکے۔ **بَلِّيْ مَنْ كَسْبَ سَيِّئَةً وَ أَخَاطَثَ بِهِ خَطَيْئَةً فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَلِدُونَ ۝** (البقرہ: ۸۱)

”ہاں! جس نے برائی کی اور برا نیوں نے اس کا احاطہ کر لیا تو بلاشبہ ایسے لوگ آگ کا ایندھن بنیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اللہ کی اس سنت میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔
إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ (النحل: ۱۱۶، ۱۱۷)

یقیناً جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں کامیاب نہیں ہونے کے ان کی قسم میں دنیا کی چند روزہ بہرہ مندی تو تکھی ہے لیکن آخرت میں دردناک عذاب ہے۔
قُلْ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذَيِّقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝ (یونس: ۶۹)

”کہہ دیجئے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ فلاح (”نجات اخروی“، برائی احمد یہ صفحہ 483) نہیں پانے کے، چند روزہ دنیا میں کھاپی لیں۔ پھر انہیں ہماری طرف لوٹ پلٹ کر آنا ہے۔ پھر ہم انہیں ان کے کفر کا شدید عذاب کی

— مزاکیت نے زاویوں سے —

صورت میں مزاچکھائیں گے۔

چونکہ جھوٹی نبوت بھی بہر آئندہ ایک گناہ ہی تو ہے لہذا اس کے بارے میں بھی ڈھیل اور تاخیر کی سنت رانی چاہئے۔ آنحضرت ﷺ کے معاملہ میں یہ سختی کہ تمہاری جانب سے ذرا بھی اگر کذب و افتراء کاظہور ہوا تو گردن مار دی جائے گی۔ اس لئے ہے کہ ان کے مقام کی بلندی اور ان کے درجہ کی رفت، اس ڈھنگ کی بغاوت کی قطعی متحمل نہیں۔ کیونکہ جھوٹے، دنیا کے طالب اور مفسد و متفقی اگر جھوٹ بولتے اور جھک مارتے ہیں تو انہیں ایسا کرنا ہی چاہئے، لیکن اللہ کے راست بازوں کو اس کی اجازت نہیں جس طرح ان کا رتبہ بلند ہے، ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں، اسی نسبت سے ان کی سزا بھی دوگنی ہے۔

وَإِنْ كَادُوا لِيَفْتَنُنَاكَ عَنِ الَّذِي أَوْخَيْنَا إِلَيْكَ
لِتَقْتِرِي عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذَا لَا تَتَحْذُوكَ خَلِيلًا ۝ وَلُو لَا إِنْ
ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كَذَّ ثَرَكْنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذَا لَا ذَقْنَكَ
ضَعْفَ الْحَيَاةِ وَضَعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا
نَصِيرًا ۝ (بنی اسرائیل ۷۲، ۷۴، ۷۵)

”یہ لوگ وحی کے تقاضوں سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی تمہیں ہٹانے لگے تھے تاکہ ہم پر افتراء کرو اور اگر تم ایسا کر گزرتے تو یہ تمہیں یقیناً اپنا یار غار بنا لیتے اور اگر ہم نے تمہیں پیغمبرانہ ثبات نہ بخشنا ہوتا تو تم ان کی طرف قدرے جھک ہی گئے تھے۔ اور اگر یہ ہو جاتا تو پھر جیئے اور مرنے کی دو ہری سزا میں ہم تمہیں چکھاتے اور ہمارے مقابلہ میں تمہارا کوئی حامی و مددگار بھی تونہ ہوتا“۔

یہ رتبہ کی بلندی ہی تو ہے کہ ان حضرات سے بسا اوقات ترک اولیٰ پر بھی

پرسش ہوتی ہے۔ حالانکہ امت کو اس کا مکلف نہیں بنایا گیا کیونکہ ان کی ہمت سے یہ توقع ہے کہ یہ اولیٰ سے اولیٰ طرف بڑھتے رہیں گے اور مباحثات کے سامنے پر ڈال کر بیٹھ جائیں گے۔ یعنی معنی ہے اس عارفانہ قول کے کہ ”حسنات العوام سینمات الابرار“ کہ ”عوام کی نیکیاں ابرار و صلحاء کے لئے بمنزلہ سینمات کے ہیں اور یہی نکتہ لطیف مضر ہے۔ سورہ فتح کی ابتدائی آیتوں میں کہ مژده فتح سناتے ہوئے اس کی صراحت بھی کر دی کہ فتح سے پہلے زندگی اس زندگی کے مقابلہ میں بمنزلہ لغزش کے ہے اور ہم نے کامیابی کی یہ خوشخبری تمہیں اس لئے سنائی ہے کہ ان لغزشوں کو فتح مبنی کے بعد بخشش و غفران نے بدل دیا جائے۔

لِيَغْفِرَ لِكَ اللَّهُ مَا تَقْدَمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأْخُرَ (الفتح: ٢)

مرقومہ بالا آیت کا یہ مطلب تو ایسا چتا ہوا اور معقول ہے جو سب کو متاثر کرے گا۔ اب قادریانی بد نہ اتنی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے تقول کے معنی میں عموم پیدا کیا اور کہا کہ اس سے مراد جھوٹا نبی ہے۔ پھر جب یہ دیکھا کہ جھوٹا نبی بھی زندہ رہتا ہے اور خدا کی دی ہوئی ڈھیل سے فائدہ اٹھاتا ہے تو محض اس اتفاق سے کہ آنحضرت ﷺ نے برابر 23 سال تک اللہ کی دعوت کو لوگوں تک پہنچایا ہے یہ استدلال کیا کہ جھوٹا نبی 23 سال تک جھوٹ نہیں بول سکتا۔ غور فرمائیے اس میں کہاں تک معقولیت ہے۔ کیا 22 سال تک تو اللہ کی غیرت جھوٹ برداشت کرتی ہے لیکن اس کے بعد اس کا تخلی اس کو گوار نہیں کرتا۔ پھر اس عرصے میں جو جھوٹ کو قبول کریں گے اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سزا جھوٹی نبوت ہی سے خاص کیوں ہے، جھوٹ اور غلط مادی نظام حیات سے کیوں اس کا تعلق نہیں؟ اگر جھوٹا نبی فتنہ و فساد کا موجب ہو سکتا ہے تو غلط مادی نظام کے پھیلانے والے اور اپنی خداوندی کی

چوکھٹ پر بندوں کو جھکانے والے اور گمراہ کرنے والے تو آئیں زیادہ مفسد ہیں۔ پھر ان کی یہ سزا کیوں نہ ہو، جھوٹا اور غلط نظام حیات 23 برس تک کیوں زندہ رہے۔ قادیانی منطق کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

پیشین گوئی کا پنجہرہ

مججزہ اور پیشین گوئی ایک ہی حقیقت کے دو ظہور ہیں، مججزہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تکوینیات میں لگے بندھے قوانین کی زنجیریں ٹوٹی ہیں اور کوئی سائنسی طریق اس کی توجیہ نہیں کر پاتا اسی طرح پیشین گوئی سے علم کے نپے تلے قواعد کی مخالفت ہوتی ہے اور علم و خبر کے معمولی اور عامہ الورود ڈھنگ سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ شق القمر مثلاً مججزہ اور خرق عادت ہے اس پر اگر صرف سائنس کے نقطہ نظر سے غور کیجئے گا تو یہ قطعی محال نظر آئے گا کہ اتنے بڑے کرے کے دو ٹکڑے ہو جائیں اور نظام سُمی میں کوئی ہلکل نہ ہو، یعنی تجاوز و کشش کے تمام دائرے جن کے بل بوتے پر بخوم و کواکب کا یہ حریت انگیز نظم و نق چل رہا ہے بغیر کسی ادنیٰ تاثر اور گڑ بڑ کے قائم رہیں۔ یعنی نہ تو چاند کے چہرے پر اس کا کوئی اثر ہو اور نہ سورج کی پیشانی پر شکن آئے۔ انسانی عقل اسے کب مانتی ہے اور عقل انسانی کی بساط ہی کیا ہے؟ یہ بیچاری تو مانا بھی چاہے تو نہیں مان سکتی۔ بھیک اسی طرح پیشین گوئی بھی خرق عادت ہے جس طرح مججزہ دلائل نبوت میں سے ہے، اسی طرح اس کا شمار بھی نبوت کے دلائل و برائیں ہی میں ہو گا، اس کا ڈھنگ بھی ایسا ہے کہ انسانی ذرائع علم و خبر سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ غلبہ روم کی پیشین گوئی ہی کو لجھئے اور اپنے طور پر غور فرمائیے کہ ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان خوفناک جنگ ہے، دونوں قومیں

اپنے زمانے کی بڑی اور تاریخی قومیں ہیں، دونوں کے ذرائع بے پناہ اور وسیع ہیں اور دونوں حرب و قتل کی خونگر اور مشتاق ہیں۔ ان دو مخفی ہوئی قوموں میں جب لڑائی ہو گی تو یہ ظاہر ہے کہ آسانی سے ایک قوم کو دوسری پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا اور پھر اگر ان میں ایک کو شکست ہو ہی گئی تو پھر چند ہی سال میں اس کا خم ٹھوک کر میدان جنگ میں دوبارہ کوڈ پڑنا اور شکست کو فتح سے بدل دینا اور بھی مستبعد ہے۔

اس کو جانے دیجئے! سوچنے کی بات یہ ہے کہ سات سال پہلے قرآن کا معین الفاظ میں فیصلہ نہ دینا کہ ایرانیوں کی اس عارضی فتح کا کوئی اعتبار نہیں رومی ہی آخر کار جنگ جیتیں گے کتنی بڑی بات ہے۔ پیشین گوئی اتنی واضح اور معین ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ قریش سے شرط باندھتے ہیں اور کے کی گلیوں میں پکار پکار کر رومیوں کی فتح کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ کیا انسانی ذرائع علم و خبر سات سال پہلے کی ایک بات کو اتنے وثوق، اتنی قطعیت اور حتمیت سے بیان کرنے پر قادر ہیں؟ پیشین گوئی کی ایک صورت بلاشبہ یہ ہے کہ ایک شخص حالات و افکار کی نسبت پر ہاتھ رکھے اور پھر اس کی چال سے آئندہ کا اندازہ کرے جیسے ہائینے نے ہیگل کے تصورات سے اندازہ کیا کہ آئندہ جرمنی کی سیاسی قسمت فرطائیت اور مطلق العنانی کا رخ اختیار کرے گی کیونکہ ہیگل کے فلسفہ میں اس کے جرا شیم پہلے سے موجود تھے جس کو اس کی بصیرت نے ازراہ فراتست بھانپ لیا۔ یہ پیشین گوئی حیرت انگیز ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ اس کی علمی توجیہ نہ ہو سکے۔ بلکہ اس کا تو کمال ہی یہ ہے کہ یہ ٹھیک ٹھیک اندازے اور تخمینے پر مبنی ہے۔

انبیاء علیم السلام کی پیشین گوئیاں ان علمی اندازوں سے قطعی مختلف ہوتی ہیں، یہاں آئندہ واقعات سے متعلق ایسی حقیقوں کا اکٹھاف ہوتا ہے جن کی تھے میں تجربہ و تجھیں کا کوئی اصول کا رفرما نہیں ہوتا۔ انبیاء علیم السلام کی پیشین گوئیاں خرق عادت یا مجرمانہ خصوصیات کی حامل اسی وقت ہوں گی جب وہ واضح اور معین ہوں اور انسانی وسائل علمی اپنے کو ان کی توجیہ سے قاصر و عاجز قرار دیں ورنہ وہ انکل سے کہی ہوئی ایک بات ہیں جو ہو سکتا ہے غلط ہو اور ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو یا وہ ایسی بے تکمیل شے ہے کہ اس کے کچھ معنی ہی مقرر نہیں۔ پیشین گوئی اور اس قسم کی مہملات میں ایک اور فرق یہ ہے کہ پیش گوئی کا پہلے نے چرچا ہوتا ہے پھر جب واقعات سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے تو ایمان و آگہی میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا ہے جیسا غلبہ روم کی پیش گوئی پر ہوا کہ جب روی ساتویں سال جیت گئے تو مسلمانوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور مہملات توجہ والفات کو ذرہ بھی متاثر نہیں کر پاتے بلکہ ان کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے اور ان میں اس وقت معنی ڈالا جاتا ہے جب بے خبری میں ایک واقع ہو جاتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قادریوں میں مرزا صاحب کی ایک پیشین گوئی کا بڑا اہتمام ہے اس کی سندات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جا رہی ہیں اور اس کے اہم اور بے تکمیل کو بڑی عیاری سے در بر کیا جا رہا ہے۔ مرزا صاحب کا ایک الہام ہے ”داغ بھرت“ اس کو موجودہ انقلاب پر چسپاں کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مرزا سیوں نے سوچا ہو گا کہ اتنی بڑی تبدیلی سے متعلق اگر مرزا صاحب کا کوئی الہام ان کی کتابوں میں سے نہ نکلا تو بڑی بحمد ہوگی لوگ

کہیں گے کہ عجیب نبی ہے جو محمدی بیگم کے نکاح کا ڈھنڈورا تو چار دنگ عالم میں پیشتا ہے مگر ملک کے اس عظیم الشان بٹوارے کے متعلق کچھ نہیں جانتا جس کی وجہ سے ان کی امت کو بننے بنائے مرکز ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تلاش اور تنفس سے معلوم ہوا کہ الامام ”داغ ہجرت“ ہے جس کی تاویل ہو سکتی ہے۔ اب غور فرمائیے پیشینگوئی جن معنوں میں خرق عادت اور غیر معمولی حقیقت ہوتی ہے اس کی کوئی جھلک بھی اس میں پائی جاتی ہے پسلے یہ تو بتائیے کہ نحو کی اصطلاح میں یہ کوئی جملہ بھی ہے جس سے سننے والے کے علم میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ خبر ہے؟ انشاء ہے؟ کیا ہے؟ یہ داغ ہجرت کیسا ہے؟ کون اٹھائے گا؟ کب اٹھائے گا؟ مومنوں اور عقید تمندوں کو یہ زحمت گوارا کرنا پڑے گی یا دشمن اسے برداشت کریں گے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اور اس میں پیشین گوئی کی کون سی ادا پہنچا ہے؟ اگر ہر بے تکلی بات ہر ممکن جملہ اور ہر خرافات کی قسم کی چیز پیشین گوئی ہو سکتی ہے تو پھر خود بے تکلی پن، اہمال اور خرافات کے لئے ہمیں اور معنی تلاش کرنے پڑیں گے۔



خلافت مرزا ائیہ

- خلیفہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں؟
- خلیفہ کی حیثیت
- خلافت راشدہ
- فہم مسائل کا قانون
- شریعت اور خلافت
- مرزا ای نکتہ نظر
- خلیفہ کی شرعی حیثیت
- مرزا ای طرز استدلال فریب کاری

کیا خلیفہ معزول ہو سکتا ہے?
انہائی اہم اور اصولی بحث

کیا خلیفہ معزول ہو سکتا ہے

”الفضل“ میں کئی ہفتواں سے یہ بحث چل رہی تھی کہ خلیفہ یا امیر جب ایک مرتبہ منتخب ہو کر مسندِ سیادت پر فائز ہو جائے تو پھر معزول نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے نصب و قیام میں جہاں امت کے حقوق و اختیار کا تعلق ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی کارفرمایوں کو بھی دخل ہے۔ اس موضوع پر اظہار خیال سے پہلے ہمیں ان حضرات سے پوچھنا ہے کہ آپ کے حلقوں میں اس پر بحث کی ضرورت آخر کیوں محسوس ہوئی۔ جب کہ آپ کے ہاں خلافت کا جو تصور ہے وہ اس خلافت سے بالکل مختلف ہے جس کے قیام و نصب پر مسلمان اسی طرح مکلف ہیں جس طرح دوسرے امور دینی پر، آپ کی خلافت اس نبوت کی یادگار ہے جس نے انگریز کی مستعرانہ دیسی سے کاریوں کو استواری بخشی بلکہ جو معرضِ ظہور میں آئی ہی اس لئے تھی کہ انگریز کے خلاف جو جذبات مسلمانوں میں موجود تھے اور نئی نئی تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ ان کو موت کے گھاث اتارا جائے۔ یہ خلافت اس نبوت کی قطعی قائم مقام نہیں ہو سکتی جو عدل و ہدایت کے نظام اجتماعی کو قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے اور جو اس نصبِ اعین کی تکمیل کے لئے بخشی جاتی ہے کہ انسانی معاشرہ کو بہترین اور متوازن اقدارِ حیات پر منیٰ ٹھہرایا جائے۔ آپ کے ہاں چونکہ نبوت کا تصور یہ ہے کہ کوئی انقلابی قسم کی چیز نہیں ہوتی بلکہ غلامی و خیمه برداری کی ذہب کی خدمات بھی اسی سے لی جاسکتی ہیں اور انگریز کے مشنوم عزمِ ائمَّہ کی وہ آلہ کا رجھی ہو سکتی ہے۔ اس

لئے خلاف بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ جو دینی انداز کی پاپائیت ہو۔ جو جمہور کے اعتماد کے بجائے کشوف و روایا ہائے قلموں کے بل پر اپنا کار و بار چلا رہی ہو اور جس کا مصرف صرف یہ ہو کہ وہ اپنے خاندان کے لئے جا گیریں خریدے، اپنے بیٹوں کو ”ہواناصر“ کہہ کر آگے بڑھائے اور چندوں کا ایک جال جو ایک مرتبہ بچھ گیا ہے اسے بھر آئندہ قائم و بر اقرار رکھے۔ اس نوع کی بحثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ای حلقوں میں خلیفہ صاحب کے خلاف ”اچھی خاصی“ اپوزیشن پیدا ہو رہی ہے اور کچھ لوگ سنجیدگی سے چاہ رہے ہیں کہ میاں محمود اس منصب سے دست بردار ہو جائیں اور کسی بہتر اور موزوں مرزا ای کے لئے جگہ خالہ کر دیں۔

خلیفہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک علمی بحث ہے اور اس میں اس وقت تک اختلاف رائے کی گنجائش ہے جب تک خلافت و امارت کے تصور کو تعبدیات کے اثرات سے الگ کر کے نہ دیکھا جائے۔ اگر خلافت کا مسئلہ اس ذہب کا ہے کہ اس میں جمہور یا ارباب حل و عقد کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نبوت کی طرح اس کی تعیین و اقامت بھی اللہ تعالیٰ کے ارادے اور انتخاب سے ہو پاتی ہے تب یقیناً اس کا عزل غلط اور ناجائز ہے اور اگر خلیفہ کے نصب و قیام کا حکم آسمان سے نازل نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کی رائے اور انتخاب سے اسی زمین پر یہ مند امارت پر بینہنا اور زمام قیادت سنبھالنا ہے، تب رائے اور اتفاق سے اس مند سے ہٹایا بھی جاسکتا ہے۔ یعنی جب خلافت کا قیام مستور ہے تو یہی مشورہ اس کے عزل کا بھی موجب ہو سکتا ہے۔ یہ بالکل سادہ سی حقیقت ہے جسے ”الفضل“ نے خواہ مخواہ الجھادیا ہے کہ جو ہاتھ عمارت کے

بنانے میں کام آسکتے ہیں وہی ہاتھ اس کو گردانیے پر بھی قادر ہیں۔

اسلام و عدل و انصاف کا علمبردار ہے اس لئے وہ یہ نہیں مان سکتا کہ کوئی حکومت یا امارت مسلمانوں پر اس طرح مسلط و مسيطر ہو سکتی ہے کہ اس کو ہٹا دینا ممکن ہو۔ کیونکہ اس کے منطقی نتائج یہ ہوں گے کہ ہم عصمت خلافت کے قائل ہوں اور یہ تسلیم کر لیں کہ جس انسان کو ہم خلافت کے لئے منتخب کرتے ہیں، اس میں محض اس انتخاب سے اور مجرد مسئلہ اقتدار پر فائز ہونے سے ملکوئی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ کبھی بھی غلطی نہیں کر سکتا۔

کیا اس دور میں اس نوع کے سیاسی الجھاؤوں کے لئے کوئی گنجائش ہے؟ خلیفہ اگر انسان ہے اور اس میں انسانی کمزوریاں موجود ہیں تو وہ بلاشبہ مسلمانوں کو ایسی راہ پر چلا سکتا ہے۔ جو ہلاکت و گمراہی کی راہ ہو اور اس طرح بہک سکتا اور خداری کر سکتا ہے کہ اگر اس کا ہاتھ نہ روکا جائے اس کے خلاف بغاوت نہ کی جائے اور اس کو اس منصب سے ہٹایا نہ جائے تو عظیم قومی خساروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ بات حقیقی دینی ہے اتنی ہی عام سمجھے بوجھ کی ہے۔ مرزائی دوست غور فرمائیں کہ نبوت کے بعد کسی شخص کی رائے کو منزہ عن الخطاۃ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور یہ مانا جا سکتا ہے کہ اس سے سیاسی و دینی غلطی کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔

خلیفہ کی حیثیت

عیہ بحث کہ خلیفہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں یا با دشہ کے سامنے قوت و اقتدار کی بے پناہ طاقتلوں کو صحیح معنوں میں استعمال کرنے کا مسئلہ بھی ہے یا نہیں۔ ایک پرانی بحث ہے جس پر ہمارے ہاں متکلمین و فقهاء کے ہاں ہی بحث نہیں ہوئی یورپ نے بھی

متوں اس کو استخوان نزاع ٹھہرایا ہے اور ان میں باقاعدہ دو گروہ ہو گئے ہیں ایک گروہ حکماء و سیاستیین کا ایسا ہے جو خلافت و اقتدار کو ایک طرح کی آسمانی اور مقدس شے قرار دیتا ہے، نہیں مانتا کہ اس میں کسی طرح کا رد و بدل عوام کی مرضی اور جمہور کی نشانہ کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اس گروپ کے لیڈر مشہور فلسفی ہائز ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں ان کے افکار کی اشاعت ہوئی۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو بادشاہت و اقتدار کے دائروں کو آسمان تک پھیلا ہوا نہیں سمجھتا۔ اس کی رائے یہ ہے کہ یہ قوت و طاقت جس سے بادشاہ بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس لئے عوام و جمہور کی مرضی سے اس کو چیلنج کرنا ممکن ہے۔ ان خیالات کی ترجیحی ستر ہویں صدی عیسوی میں جان لاک نے کی اور اسی سے حکمرانی و سلطانی کا سحر اس طرح دور ہوا کہ اب کوئی پڑھا لکھا شخص بھی اس کا قائل نہیں کہ حکومت و اقتدار کے عزل و قیام میں عوام کی مرضی کو کوئی دخل نہیں۔ ہمارے ہاں یہ تصور کہ خلافت انتخابی و جمہوری انداز کا مسئلہ نہیں دو جہتوں سے آیا ہے۔ ایک تو شیعی مدرسہ فکر نے اس کی اشاعت کی ہے کیونکہ یہ گروہ اگر انتخاب و شوریٰ کو خلافت کی بنیاد ٹھہرا تا ہے تو اس کی پوری آئندیا لو جی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان لوگوں نے عدم اخلاف کو اس ذہب سے پیش کیا کہ یہ بھی کوئی نبوت قسم کی چیز ہے جس میں انسانی معیاروں کا خیال نہیں رکھا جاتا اور محض بخشش اور محبت سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ دوسری سمت ملوکیت اور اس کے شعراء کی ہے جب خلافت کے بعد نیابت و اختیار کی زمام جابر و قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں میں آئی تو شعراء و مصنفوں نے انہیں انعام و خلعت کے لائق میں ظل اللہ، ظل سبحانی اور اس انداز کے لقب سے مخاطب کرنا شروع کر دیا جس سے بجا طور پر یہ شبہ ابھر سکتا تھا کہ ان لوگوں کو یہ اختیارات محض اللہ کی عنایت و بخشش سے ملے ہیں اور ان اختیارات کو مجروح کرنا خود اسلام کو مجروح

کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ اسلامی ادب و تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کیجئے تو متعدد مثالیں اس کی ملیں گی۔ ایک شاعر نے کھلے بندوں اپنے مددوں کے بارے میں کہا:-

ولقد اراد اللہ از ولا کہا من امة اصلا حها ورشادها
کہ اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں خلیفہ ٹھہرایا اور مقرر کیا تو اس میں امت کی
اصلاح و رشاد کی مصلحتیں پہنچائیں۔

خوشامد و تعریف کے تقاضے اس حد پر کئے نہیں بلکہ ایک بدجنت نے بادشاہ کو تو بالکل خدا ہی بناؤالا ” ما شئت لا ماشاءت الا اقدار فاحکم فانت الواحد القهار ” (جو کچھ تو چاہے گا وہی ہو گا۔ قضاو و قدر کے ارادے نہیں چلنے کے۔ پس تو حکم دے کیونکہ تو ہی واحد و قهار ہے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بائیں جلالتِ قدر ایک منطق کی کتاب پر تحریک لکھتے ہوئے رقم فرمایا: جعلته عراضته لحضرۃ من خص الله تعالیٰ بالسلطۃ الا بدیۃ وایدہ الله بالدولۃ السرمدیۃ الخ (میں اس کو بادشاہ کے حضور پیش کرتا ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے ابدی سلطنت سے نوازا ہے اور دولت سرمدی سے مالا ملا کیا ہے) مصنفوں و شعرا، کی یہ عام اور بیسوں کتابوں سے اس نوع کی عبارتیں نقل کی جاسکتی ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ انداز بیان اس مجاز کا بھی حامل ہے جس کا حق ایک ادیب اور شاعر کو دینا چاہئے۔ اور اس سے کوئی علمی مسئلہ مستنبط نہیں ہوتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس انداز بیان سے غیر شعوری طور پر یہ عقیدہ ذہنوں میں پیدا ہوا کہ بادشاہ کے اختیارات براہ راست خدا کے بخشے ہوئے ہیں۔

خلافتِ راشدہ

نفسِ مسئلہ کی چھان بین کے لئے ان دونوں سمتوں سے الگ ہو کر ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ منصبِ خلافت کی حقیقت کیا ہے۔ کیا یہ نبوت کی طرح براہ راست اللہ تعالیٰ کے انتخاب و اصطفاء سے متعلق ہے یا اس کی تشكیل جمہور مسلمان کرتے ہیں اور یہ ایسا منصب ہے جس سے دینی و ثقافتی اقدار و ابستہ ہیں۔ زیادہ تفصیلی بحث کی ان صفحات میں گنجائش نہیں اس پر غور فرمائیے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب خلیفۃ اللہ کہا گیا تو انہوں نے صاف صاف فرمایا لست خلیفۃ اللہ و لکنی خلیفۃ الرسول اللہ ”میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں“ اس سے معلوم ہوا کہ خلافت کی طاقت کا سرچشمہ منبع اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہے بلکہ وہ ایک فریضہ ہے جو آنحضرت ﷺ کے بعد امت پر، امت کی مرضی سے عائد ہوتا ہے اور دوسرے فرائضِ دینی کی طرح اس میں دونوں طرح کے اختلال ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کوئی شخص اس کے تقاضوں کو کما حقہ سمجھے اور بہتر طریقہ سے انجام دے اور یہ کہ بہتر طریق سے انجام نہ دے اور اس میں تبدیلی و تغیری کی ضرورتوں کا احساس ہو۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسئلہ خلافت میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف رائے ہوا اور اس اختلاف رائے نے آخر کار خلافتِ راشدہ کی طرح ذاتی اور ایک مثالی حکومت دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کی۔ اب اگر خلافت کا مسئلہ انسانی اختیار کا مسئلہ نہیں تھا اور خلیفہ اسلام کا قیام بطریق انتخاب نہیں ہو سکتا تھا تو پھر اس اختلاف رائے کی کیا توجیہ کی جائے گی۔

تاریخ اسلام کا ادنیٰ طالب علم بھی اس پیش پا افتادہ بات کو جانتا ہے کہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب معرضِ ظہور میں آیا۔ یہاں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہوئی جس سے یہ شبہ تک ابھر سکے کہ خلافتِ ایسا حق ہے کہ جس کا تعین و تحقیق سراسر اللہ کی مرضی پر مخصر ہے اور عام ارادوں اور مرضی کا اس بارے میں لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ اگر مسئلہ کی یہ نوعیت نہ ہوتی تو اسلامی تاریخ کے ابواب اس ڈھنپ سے نہ لکھے جاتے اور اس ڈھنگ کے جھگڑوں کا اس میں نشان نہ ملتا۔ اب سوچنے کی چیز یہ ہے کہ جو بات اہل الرائے کی مرضی سے اتمام و تکمیل کی منزلیں طے کرتی ہے وہ ان کے احتساب سے دوسرا قلب اور سانچہ کیوں اختیار نہیں کر سکتی جس اقتدار کو یہ جنم دیتے ہیں اس اقتدار کو چھین کیوں نہیں سکتے؟ اور جب خلیفہ کو یہ تقدیس خدا نہیں بخشی ہے۔ اللہ کے رسول نے عطا کی ہے اور جمہور بھی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی ذات میں اختیار و اقتدار کو اس انداز سے نہیں مانتے کہ اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو سکے تو یہ ”اقتدار مطلق“ آتا کہاں سے ہے؟

فهم مسائل کا قانون

ہر مسئلہ کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر غور و فکر کرتے وقت ہمیں کس طرح کے ذرائع سے کام لینا ہے۔ جو چیز تو لئے کی ہے اس کا وزن تول ہی سے معلوم ہو سکے گا اور جو سوٹھنے کی اور دیکھنے کی ہے اس میں قیاس آرائی اور انکل سے کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ طبی مسائل کے حل کے لئے جغرافیائی معیاروں سے استمد ادنیں کی جائے گی اور جغرافیہ کی سچائیوں میں فلسفہ و حکمت کا قانون چلنے والا نہیں۔ محسوسات کو محسوسات کے عالم میں رکھا جائے گا اور قیاسات و افکار کے لئے فکر و عقل ہی کی دنیا موزوں رہے گی۔

فہم مسائل کا یہ اتنا بچاتلا اور فطری قانون ہے کہ اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے اور ہر مسئلہ کی ایک جگہ اور مقام متعین نہ کیا جائے اور اس کی چھان بین اور تحقیق و تخصص کے دائروں کی نشاندہی نہ کی جائے تو عجیب و غریب اور مضطہ خیز غلطیاں سرزد ہوں گی۔ جو چیز تولئے کی ہے اس کا اندازہ قوت شامہ سے نہیں ہو سکتا اور جو حقیقت دیکھ کر محسوس کر کے بتانے کی ہے اسے سوچ سمجھو اور غور و فکر کی صلاحیتیں حل نہیں کر سکتیں۔ امراض و علاج کی بحثوں کے لئے طب کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جغرافیائی تحقیقات کے لئے انہی چیزوں سے مدد لی جائے گی جن کا لگاؤ جغرافیہ سے ہے۔ اسی طرح فلسفہ کی ایک دنیا ہے اور اس کے مسائل ہیں۔ جو فلسفہ ہی کی زبان میں بیان ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے ایسا پیرایہ بیان اور انداز غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے جس کو اس غرض کیلئے وضع نہیں کیا گیا یونا نیوں نے ایک ہمہ گیر اور عظیم غلطی یہ کی کہ ہر ہر مسئلہ کو میٹا فرکس کی عینک سے دیکھا حالانکہ یہ نقطہ نظر عقلی مباحث کے لئے موزوں ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے جب طب پر بحث کی تو اس کی روشنی میں ہیئت و نجوم کی گتھیوں کو سمجھایا تو اس زاویہ نظر سے اور ٹھوں مادی مسائل پر گفتگو کی تو اس لب و لہجہ اور زبان میں جو صرف مابعد اطیبی فنون کے لئے مخصوص تھی مثلًا ستاروں کی چال اور افلاک کی حرکت سے متعلق ایک عامۃ الورود سوال یہ تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے کیا وہ ہمیشہ ایک دائرے میں ہوتی ہے یا دائرے میں نہیں ہوتی؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب صرف مشاہدہ ہی دے سکتا تھا لیکن انہوں نے مشاہدہ غیر ضروری لکھ رہا تھا ایک دلیل گھڑی کہ چونکہ دائرہ میں حرکت کرنا حرکت کا کامل ترین تصور ہے ہے اور فلک کی حرکت کا مل ترین حرکت ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دائرے میں ہو۔ جب تک بڑی بڑی دور بینیں معرض وجود میں نہیں آئی تھیں اور عظیم الشان

رصدگا ہیں قائم نہیں ہوئی تھیں اور کچھ دوسرے ذرائع سے حقیقت کا اتنا پتہ نہیں ملا تھا اس کو مانا گیا لیکن جو نہی فلسفیات کی تحقیق نے تجربہ کی روشنی میں یقینی قدم اٹھائے اس میں فرزکس کی تردید ہو گئی اور معلوم ہوا کہ مختلف ستاروں کی حرکت کا انداز مختلف ہے۔ تشریح الابدان و وظائف اعضاء سے متعلق عجیب عجیب رائیں قائم کی گئیں اور محض قیاس و رائے کے بل بوتے پر جسم انسانی کا ایک نقشہ بنایا گیا جس کی بعد میں تردید ہو گئی۔ مادے کی تقسیم کے بارے میں اجزاء تجزیی کاظمی کاظم کیا گیا کیونکہ ذہن فی الواقع یہی چاہتا ہے کہ تقسیم کے بعد تقسیم کا کام جاری رہے حالانکہ موجودہ سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تجزیی و تقسیم پر ایک منزل ایسی آتی ہے جب یہ ختم ہو جاتی ہے اور مادہ کہربائی نقطوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہتا۔ یونانی علوم کے ترجموں سے یہ بدعت و بدمناذقی ہمارے ہاں بھی آئی اور ہم نے بھی مسائل پر اس انداز سے سوچنا شروع کیا کہ ان کی اصلی سرحدوں کو باہم خلط ملٹ کر دیا۔ پانچویں منطق کی مشکلات پر قابو پانے کے لئے فلسفہ کی مدد چاہی گئی اور فلسفہ کو کلام کی روشنی میں دیکھا گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا کہ خواہ خواہ الجھاؤ پیدا ہوا اور پیچیدگی بڑھی۔

شریعت اور خلافت

بالکل یہی صورتحال مسئلہ خلافت سے متعلق پیش آئی۔ یہ مسئلہ اپنے مزاج تفصیلات اور نتائج کے اعتبار سے خالص سیاسی نوعیت کا ہے۔ لیکن شریعت کو بہر حال اس سے اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ اس نے جو اصول طے کر دیئے ہیں ان پر عمل کیا جائے اور جو غرض و غایت حکومت و ریاست کی متعین کی ہے وہ بہر آئینہ ہیئت حاکمہ میں منعکس اور موجود رہے اور بس۔ یہ آلمیات سے متعلق نہیں اور تعبدیات سے وابستہ

نہیں مگر ہمارے علماء نے اس کو بھی ایک کلامی مسئلہ بنادیا اور اس طرح اس کے سرے آلهیات و تصور سے جاملائے کہ موجودہ سیاسی سانس میں اس کی حقیقت معین کرنا و شوار ہو گیا۔ بات صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں کا ایک آئینی سربراہ ہونا چاہئے اور اس کو وہ خدمت انجام دینا چاہئے جو اسلامی ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہے۔ اور جب وہ یہ خدمت انجام نہ دے سکے تو ”ارباب حل و عقد“ ایسے آدمی کو آگے بڑھائیں جو اس خدمت کو زیادہ بہتر طریق سے ادا کر سکے۔

مرزا ثیت نکتہ نظر

اس میں کون سی ایسی چیز ہے جو سمجھ میں آنے والی نہیں لیکن براہو خلط بحث اور بیہودگی کا کہ اس میں بھی وہی غیر معقولیت اختیار کی گئی اور اس پر بھی یوں غور ہونے لگا کہ گویا یہ کوئی ایسی عقیدہ کی بحث ہے جس پر عملی و سیاسی دنیا میں تجربہ نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ ایسی خلافت جس کے حدود کار چندہ کی تحصیل و صرف کے خانوں تک محدود ہوں۔ ایسی خطرناک نہیں ہو سکتی کہ اس کو ہٹانے کا سوال کبھی پیدا ہو۔ لیکن وہ خلافت جو بہت بڑی سیاسی طاقت ہو اور جس کے فیضوں سے ایک ملت کی زندگی بچ سکتی یا معرض خطر میں پڑ سکتی ہو اس کو تلقید سے بالا سمجھنا اور خدا قرار دینا ایسی بے وقوفی ہے جس کی کبھی تلاش نہیں ہو سکتی۔

مرزا ثیت مولوی فاضلوں کو شاید معلوم نہیں کہ ایک انسان جتنے بڑے اقتدار کا مالک ہو گا اسی نسبت سے وہ ظلم و استبداد کو منوانے کی زیادہ صلاحیتیں رکھے گا۔ خلیفہ کی ایک لغزش اور حکمران قیادت کی ملت کے خلاف ایک نداری صدیوں تک کے لئے مسلمانوں کے ایک گروہ کی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے تو کیا اسلام ہمیں اس کی

اجازت نہیں دیتا کہ اس قوت کا جائزہ لیتے رہیں۔ ہمیں بتایا جائے کہ اختیار کی غیر محدود قوتوں کو پا کر ایک انسان آخراتنا بے بس کیوں ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی لغوش کوئی غلطی اور کوئی گناہ نہ زدہ ہو۔ کیا انسانی تاریخ سے اس کی کوئی مثال مل سکتی ہے کہ مجرداً اختیارات کی بے پناہی سے کوئی شخص معصوم ہو گیا ہو اور جرام پیشی کا ہر جذبہ اس میں دب گیا ہو۔

اس مسئلہ کو خالص سیاسی معیاروں سے دیکھئے کہ جس شخص کو مسلمانوں نے اپنے لئے خلیفہ چتا ہے اس کے بارے میں یہ یقین کب پیدا ہوا ہے کہ اس انتخاب کے بعد اس سے غلطی نہیں ہو گی اور اس کی نفیاً خواہشوں سے ملت کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ کبھی کسی آئینی سربراہ سے متعلق کسی قوم نے اس طرح کی رائے قائم کی ہے؟ یا اس طرح کی رائے قائم کرنے کے لئے کوئی سیاسی وجہ جواز ہے۔ قادیانی دوست سوچ سمجھ کر جواب دیں کہ ان کے نقطہ نظر سے کس طرح کی سیاسیات پیدا ہوتی ہیں اور حکومت کا کیا نقشہ ترتیب پاتا ہے اور کیا اس نقشہ کے ماتحت اس صدی میں کوئی حکومت چل سکتی ہے؟

خلیفہ کی شرعی حیثیت

فقہی حیثیت سے خلیفہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کا وکیل ہے۔ لہذا جب تک موکل یہ سمجھے گا کہ اس کا مقرر کردہ نائب اس کی تربجمانی کے حقوق ادا کر رہا ہے اس وقت تک وہ اس کو قائم رکھے گا اور جب یہ ثابت ہو گا کہ وکالت کی ذمہ داریوں کو وہ ٹھیک سے ادا نہیں کر رہا ہے تو اس کو اختیار ہو گا کہ اس سے وکالت و زعامت کی باگ چھین لے۔ اگر خلیفہ کی ٹھیک ٹھیک یہی فقہی حیثیت نہیں ہے اور اس کا

منصب کوئی دوسرا فقہی شکل رکھتا ہے تو اس کی وضاحت ہونا چاہئے لیکن شرط یہ ہے کہ گفتگو فقہ و سیاست کی اصطلاحوں میں ہو اور اس کے دائروں میں رہے۔ قرامط کی زبان میں نہ ہو۔

سیاسیات کو چھوڑ کر دینی نقطہ نظر سے اگر غور کیا جائے تو صرف یہ بات اس سلسلہ میں تنقیح طلب رہ جاتی ہے کہ خلیفہ میں تقدیس کہاں سے آتی ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن و حدیث میں کہیں یہ فرمایا ہے کہ تم جس شخص کو اپنے ناقص علم کی بناء پر ایک دفعہ خلیفہ چن لیتے ہو میں اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لغزش و خطاكے امکانات چھین لیتا ہوں۔ یا یہ قصہ ہے کہ جمہور مسلمان ووٹ اور رائے کے ساتھ ساتھ تقدیس کی کوئی مقدار بھی خلیفہ کو دیتے ہیں جو جمع ہو کر ایسی ہو جاتی ہے کہ گناہ کے تقاضوں پر غالب آجائے۔

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ مسئلہ خلافت اور اس کا نصب و قیام خالص سیاسی مسئلہ ہے اور فقہی بحث ہے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ فقہ و سیاست کی زبان میں گفتگو کی جائے اور انہی دلائل سے کام لیا جائے جن کا کوئی تعلق عملی سیاست یا فقہی نکات سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس انداز تحقیق کو چھوڑ کر تصوف و اسرار کا پیرایہ، بیان اختیار کیا جائے تو لامحالہ اس تنقیح میں اور البحاؤ پیدا ہوں گے۔ مگر اس کو کیا کہجئے کہ مزائیت چونکہ تعبیر ہی ایک طرح کے انحراف سے ہے اور اس کے تمام دلائل میں اسی ٹیڑھ کو بنی و اساس ٹھرا یا گیا ہے اس لئے یہ امید ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی مسئلہ پر اس انداز بیان کو چھوڑ سکتے ہیں اور ایسا اسلوب اختیار کر سکتے ہیں جو اس سلسلہ میں موزوں ہے۔

مرزا تی طرزِ استدلال یا فریب کاری

مرا اپنیت کے بارے میں سارا رونا اسی بات کا ہے کہ اس سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ ایک گمراہی پھیلتی ہے یا ایک تاویل کی غلطی سرزد ہوتی ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے فکر و عقل کا پورا سانچہ ہی بگڑ جاتا ہے اور اس میں صحت و استواری کے لئے گنجائش ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ یہ دیکھئے کہ مولانا ابوالعطاء صاحب جalandhri یہ مانتے ہیں کہ ”اہل سنت میں سے محققین کا یہ عقیدہ ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تقریر میں ایک حد تک اہل ایمان کی آراء کا دخل ہوتا ہے مگر ان کے عزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ درحقیقت ان کا تقریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایک حد تک کی قید میں یہاں جو الجھاؤ مخفی ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں مگر زیادہ مضحكہ خیزی اس عبارت میں ہے جو ”مگر“ کے بعد ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ خلیفہ کو مجلس شوریٰ چنتی ہے اور اس مفاہمت کی بناء پر چنتی ہے کہ خلیفۃ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا۔ اسلام کے نفاذ میں حتی الامکان کوشش رہے گا اور کوئی بات ایسی نہیں کرے گا جس سے اسلام یا مسلمانوں کا وجود خطرہ میں پڑ سکے مگر جو نہیں کہ خلیفہ کا انعقاد ہو چکتا ہے اور تقریر معرض وجود میں آ جاتا ہے پھر احتساب و محاسبہ کی کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو خلیفہ کو اس مفاہمت و اقرار پر قائم رکھ سکے۔“

یہ طریق استدلال جس قدر عجیب ہے خود مولانا ابوالعطاء صاحب کو اس کا اعتراف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منتخب ہونے کے بعد وہ انسانوں کی آراء کے تابع نہیں رہے گا یہ صورت حال بظاہر عجیب ہے۔ (بظاہر نہیں بلکہ حقیقتاً عجیب ہے) مگر زرا غور کیا جائے تو یہ معقول اور درست معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں

فرمایا۔ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمَلُوا الصَّالِحَاتِ لَيُسْتَخْلَفُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵: النور) کہ ”مومنوں سے میں خلیفے بناؤں گا“، ”خلیفے بناؤں گا“ کے ترجمہ پر غور کیجئے کیا اس سے بڑی تحریف ترجمہ معنی میں ہو سکتی ہے؟ آیت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ مسلمان اگر ایمان و عمل کے تقاضوں کو پورا کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ تمکن و اختلاف کی نعمتوں سے بہرہ مندر رہیں گے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ بنے بنائے خلیفے مہیا کرے گا تحریف ہی نہیں افسوس ناک جہالت بھی ہے۔ اس دعویٰ کو اسرار کی زبان میں قادریانی مولا نایوں بیان فرماتے ہیں یقیناً نبی اور خلیفہ کے درجہ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ (یعنی نبی اللہ کے انتخاب سے ہوتا ہے اور خلیفہ کو ارباب حل و عقد منتخب کرتے ہیں) مگر جہاں تک نفسِ عقد ہے اس میں دونوں کا نصب ایک ہی ہوتا ہے۔ دونوں خدائے قادر کے مظہر ہوتے ہیں۔ ”نبی“ اگر پہلی قدرت ہے تو خلیفہ قدرت ثانیہ ہے۔

قادیانی کے تمام مولوی فاضل از راہِ کرم سوچ سمجھ کر بتائیں کہ دلیل کی یہ کون سی قسم ہے۔ یہاں اس عالمِ گوناگوں میں آخر کون سی چیز ایسی ہے جو برداہ راست اس کی صفات تخلیق و ربوبیت کا ظہور نہیں۔ پھر کیا ہر ہر چیز کی اصلاح اور تبدیلی منوع ہے۔ ہمیں مطلع کیا جائے کہ قدرت اولیٰ و ثانیہ کی تقسیم سے مسئلہ زیر بحث پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ جب تک قادریانی علم الکلام کے ترجمان کتاب و سنت کی کسی نص سے یہ ثابت نہیں کر دیتے کہ خلیفہ کا عزل منوع ہے یا پیشکش سائنس کی اصطلاحوں میں اس کی افادیت کا یقین نہیں دلاتے نفسِ موضوع اپنی جگہ سے ملنے والا نہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ افضل کے صفات میں کوئی معقول دلیل ایسی مل جائے جن پر ان

کے دعویٰ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ لے دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے اللہ تھمیں تصمیق فمیصا فان ارادوک علی خلعه فلا تخلعه ”اللہ تھمیں خلافت کی عباد پہنائے گا اس لئے اگر کچھ لوگ اسے اتروانے کی خواہش کریں تو تم اس کے لئے تیار نہ ہونا“ کہ جس سے یہ غلط فہمی ابھر سکتی ہے اور یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہاں یہ قباقونکہ خود اللہ نے پہنائی ہے۔ اس لئے شاید وہی ہمیشہ اس کا اہتمام کرے لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ صرف ایک پیرا یہ بیان اور مجاز ہے جس کے معنی اس سے زیادہ نہیں کہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے اور حق بجانب ٹھہراتے ہیں اور پیشین گوئی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ پہلے سے خبردار کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر با غنی یا اشرار اس جائز اور صحیح انتخاب کو کا عدم قرار دینا چاہیں تو ان کے ان مشووم عزم اُم کے سامنے پر ڈالنے کی ضرورت نہیں اور اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی خصوصیت نہیں۔ ہر خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ با غیوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے۔

باقی رہی یہ حقیقت کہ آیا مجلسِ شوریٰ جس نے خلیفہ منتخب کیا ہے۔ اس کو عزل کا اختیار ہے یا نہیں یا وہ ہاؤس جس نے اسے چنان ہے وہ اسے عند الضرورت ہٹا سکتا ہے یا نہیں تو یہ بالکل دوسری بحث ہے۔ وَ أَمْرُهُمْ شُوریٰ بَيْنَهُمْ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ان کے مشورہ کو ماننے پر مجبور ہے۔ ہم نے مختلف پیرايوں میں اس پیش پا افتادہ حقیقت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ خلیفہ کے نصب و قیام سے لے کر اس کے عزل و تعطیل تک کے تمام اختیارات برآ راست انسانوں سے متعلق ہیں کیونکہ جب یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اُنہیں منتخب کرتی ہے تو

یہی جماعت لامحالہ اس کو اپنے راستے سے ہٹا دینے پر بھی قادر ہو گی۔ اس پر قادیانی معارضہ ملاحظہ ہو۔ ”دنیا میں سینکڑوں ہزاروں کام ایسے ہیں کہ ان کو انسان سرانجام دینے کے بعد از روئے قانون شریعت یا قانون قدرت بگاڑنے یا منانے کا مجاز نہیں۔ بیٹھ کی پیدائش میں ماں باپ کو اس سے کہیں زیادہ دخل ہے جتنا خلیفہ کے انتخاب میں لیکن کیا شرعاً یا قانوناً ماں باپ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو قتل کر سکیں۔

ایک واضح شرعی مسئلہ ہے زید اپنی مرضی سے اپنے ہی ہاتھوں سے پیمنہ کی کمائی خرچ کر کے اینٹ اور چونے کی مسجد اللہ تعالیٰ کے نام پر تعمیر کرتا ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد جب لوگ اس میں نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں تو کdal لے کر اسے گرانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی اہم دینی عالم ہے جو اس مسجد کے معمار کو اسے مسماਰ کرنے کی اجازت دے؟“ (انضل سورہ 15 جوہری 52)۔

کا نام تو اہل علم نے سنا ہو گا مگر ”مثال مع الفاروق“ کا نہیں یہ معارضہ اسی ذہب کا ہے کیونکہ صاحب، اگر بیٹا کسی کو قتل کر ڈالے اور اتفاق سے باپ عہدہ قضاء پر فائز ہو تو سزا کا حکم سنائے گا یا نہیں۔ اسی طرح مسجد اگر بو سیدہ ہو جائے یا کافی نہ ہو یا نماز یوں کی ضروریات کو پورانہ کر سکے تو تعمیر نو کی غرض سے اسے مسمار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس میں فتویٰ طلب کون سی بات ہے۔ ہر بات کا تردید کرنا ضروری نہیں۔ قادیانی علماء کو خلیفہ صاحب کے مصالح سے الگ ہو کر اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے اور اس بات کی عادت ڈالنا چاہئے کہ کبھی کبھی دوسروں کی کہی ہوئی حق بات کو بھی مان لیا جائے۔



سیاسی پس منظر
برٹش
گورنمنٹ
سے
وفاداری

- مِرزا نیت کا سیاسی پس منظر
- پنجاب اور حکومتِ باطلہ کی تائید؟
- شیطان سے دوستی اور اس کے چیلوں سے دشمنی
- مِرزا نیت کی معذرت
- جعل سازوں کی خاص تکنیک
- نبوت سے دست برداری

مرزا نیت کا سیاسی پس منظر

میاں محمود صاحب آج کل اس بات کے درپے ہیں کہ کسی طرح مرزا نیت کے خلاف اس الزام کی تردید کا سامان بھم پہنچا میں کہ مرزا نیت نے تحدہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے کھونٹوں کو دلوں اور دماغوں میں گازنے کی کوشش کی ہے یعنی جسموں پر تو انگریزی حکومت کا قبضہ تھا ہی، مرزا نیت نے یہ تبلیغ کی اور اپنے مریدوں کے دلوں میں یہ عقیدہ مرتمم کرنا چاہا کہ انگریز کی اطاعت، اس کی خیسہ برداری اور اس کے اثر و نفعوں کو اسلامی ممالک تک پھیلانے اور بڑھانے کی مہم عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن و حدیث میں اور فقہ و اصول کے مسائل میں تو ہم نے تاویل کی کارروائیاں دیکھی ہیں کیونکہ وہاں اس کے لئے کم از کم وجہ متحملہ ہے وہاں ادبی، نحوی اور فقہی و اصولی نقطہ نظر سے ایسی گنجائشیں فی الواقع ہیں کہ تاویل کا امکان رہتا ہے۔ اور اس سے استنباط مسائل میں مدد ملتی ہے لیکن تاریخی حقیقوں میں تاویل نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں سرے سے پچ ہی نہیں ہوتی اور پھر تاریخ بھی وہ کہ جس پر ابھی چند ہی برس گزرے ہیں۔ یہ قادری اعجاز، یا خن سازی کا کرشمہ ہے کہ میاں صاحب (بیشتر الدین محمود) مرزا نیت کی ایک نئی تعبیر پیش کر رہے ہیں۔ اور بالکل نئی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ جس کو ماضی کی تحریرات اور روح سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ ہمیں ان کی مجبوریوں کا احساس ہے یقیناً ہندوستان بٹ چکا ہے انگریزی اقتدار کا منحوس سایہ سروں سے اٹھ چکا ہے اور مرزا نیت کے لئے قدرتاً آب و ہوا میں وہ سازگاری نہیں

ہے جو انگریز کے وقت تھی اس لئے ظاہر ہے مرزا ایت کو اب اس دم خم سے نہیں پیش کیا جاسکتا کہ ”حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مرزا صاحب کے نہ مانے والوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ (خطبہ میاں 20 اکتوبر 1945ء) میاں محمود صاحب نے بار بار اس حقیقت کو ماضی میں پیش کیا ہے کہ مرزا صاحب چونکہ نبی تھے اس لئے نہ مانے والوں کے کفر سے متعلق کیوں شبہات پیدا ہوتے ہیں؟“۔ مگر اس وقت یہ بات کہنا دشوار ہے کیونکہ اب معاملہ براہ راست مسلمانوں سے آپڑا ہے۔ اور انگریز درمیان میں نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اب کھل کر میاں صاحب اس حقیقت کا اظہار نہیں کرتے۔ بلکہ اب تو الفضل والے یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ یہ اسی قبیل کی ایک بے وقوفی تھی جس طرح کی دوسرے مسلمانوں نے ایک دوسرے کو کافر شہرا کر کی۔ گویا اب نہ مرزا صاحب نبی ہیں اور نہ انکا کفر کو مستلزم! یعنی لا ہور اور قادیانی وربوہ میں مصالحت ہو گئی ہے۔ خدا کرے مولوی محمد علی بھی پرانے اختلافات کو بھول جائیں اور میاں محمود کو گلے لگالیں۔

ہمیں اس سے کوئی دل چھپی نہیں کہ میاں صاحب پہلے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے یا اب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ ایسا اتفاق ہے جس کی مضرت سے ہم محفوظ ہیں۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انگریز کی افتراق انگیز حکمتِ عملی نے انہیں پیدا کیا۔ انہیں پروان چڑھایا، مخصوص استعماری اغراض کی تیکمیل کی خاطر اسلامی ممالک میں پھیلایا۔ انگر بزر کے بل بوتے پر انہوں نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اور آئندہ ارادے بھی ان کے بالکل وہی ہیں جو اس سے پہلے تھے۔ کہ انگریزی اقتدار عالم اسلامی میں اگر رہتا ہے تو مرزا ایت کے لئے بھی گنجائش ہے۔ اور یہ اقتدار اگر ہتنا اور سہتنا ہے تو مرزا ایت کے پسندے کی بھی کوئی امید نہیں رہتی۔ انگریز سر پرست ہے اور

بقول ان کے ان کی تلوار ہے جس سے دشمنوں کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس تبدیلی اور نفاق کی ہم ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ اس سے ہماری خارجہ پالیں متأثر ہوتی ہے۔ عالم اسلامی میں انگریزی اقتدار کے ہونئے اور استواری سے لڑتے ہیں۔ اور اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم بغیر کسی تمهید و تصریح کے چند حوالے درج کرتے ہیں۔ ان کو پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ انگریز کی اس پود کے عقائد و عنیدیات کا عالم کیا ہے۔ اور ان کا وجود دنیا کے اسلام کیلئے کتنا خطرناک ہے۔؟ ” موجودہ زمانے کے متعلق جو پیشگوئیاں ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا اور ان کی ترقی کے لئے ہوں گے اور جہاں جہاں ان کی حکومت ہوگی وہاں احمدیت کی تبلیغ کے لئے اللہ تعالیٰ کے فضل سے راستہ کھل جائے گا۔ (الفصل قادیان صفحہ 4 جلد 2 نمبر 211، 14 ستمبر 1939ء)

” ہماری تو دعا ہے کہ اس گورنمنٹ کو آسمانی گورنمنٹ ہر میدان میں کامیاب کرے اور بصرہ و بغداد تو کیا چیز ہے بلکہ ہماری تو دعا ہے کہ ساری دنیا میں اس کاراج قائم ہو جائے۔ (الفصل قادیان جلد 4، 6 مئی 1917ء)

” میں سولہ برس سے برابرا پتی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانان ہند پر اطاعت گورنمنٹ بر طانیہ فرض ہے۔ ” اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی مورخہ 10 دسمبر 1894ء ” میں نے باپیں برس سے اپنے ذمے فرض کر رکھا ہے کہ ایسی کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو اسلامی ممالک میں ضرور بھیج دیا کروں گا ” (اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد 2، ہم صفحہ 26)

حضرت مسیح موعود (مرزا قادیان) فرماتے ہیں کہ ” میں وہ مہدی معہود ہوں اور گورنمنٹ بر طانیہ میری وہ تلوار ہے جس کے مقابلہ میں ان علماء کی کچھ پیش نہیں

(الفصل قادیان جلد 6 صفحہ نمبر 42 مورخہ 7 دسمبر 1918ء)

”پورے بائیکس برس سے ہمارے امام (مرزا غلام احمد قادیانی) اس خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ پچاس کے قریب ایسی کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں تالیف کی ہیں جن میں بار بار مسلمانوں کو اس گورنمنٹ کی اطاعت کی ترغیب دی اور جہاد کی مخالفت کی ہے۔ اور وہ کتابیں نہ صرف بریش انڈیا میں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں شائع کر دی ہیں اور اس مضمون کے اشتہارات بھی شائع کئے ہیں کہ ہمیشہ اس گورنمنٹ کا سچا خیرخواہ رہے۔ ہر ایک جو آئین ہیئت کرتا ہے اس کو اپنے اندر یہ تبدیلی کرنی پڑتی ہے کہ وہ درحقیقت اس گورنمنٹ کا سچا خیرخواہ بن جائے۔

(ریویو آف ریلیجس 1902ء)

”اللہ تعالیٰ نے اپنے سلسے کی ترقی کیلئے اسی سر زمین کو چنان ہے جو گورنمنٹ برطانیہ کے ماتحت ہے۔ اس لئے بھی مبارکباد کے قابل ہے اگر کوئی سلطنت اس سے بڑھ کر اچھی اور عمدہ ہوتی تو خدا تعالیٰ اپنے سلسے کی نشوونما کے لئے اسی کو چنان۔ پس یہ حکومت جس قدر وسیع ہوگی ہمارا سلسلہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔

(خطبہ جمعہ میاں محمود مندرجہ الفصل جلد 4 نمبر 61، 6 مارچ 1917ء)

پس مرزا محمود تاریخ کے ان ھائکوں کو بدل دینے پر قادر ہیں؟ اور اب ان کی رائے انگریز کے متعلق یہیں۔
پیغمبر اور حکومتِ باطلہ کی تائید؟

ربوہ کے سالانہ جلسہ (۱۹۵۰ء) کے موقع پرمیاں محمود نے ایک اہم تقریر کے دوران اس الزام کی تردید کی ہے کہ مرزائیت کے معنی انگریزی حکومت کی خیمه برداری کے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مقررین نے بھی خصوصیت سے اس

الزام کی تردید کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دفاع و تردید میں اس الزام کو سرفہرست رکھا گیا اور یہ کہا گیا کہ ”اگر مرازائیت کی جنین نیاز سے انگریز کی محبت و عقیدت کا نہ مٹنے والا داغ دور ہو جائے تو پھر مرازائیت کو بلا شبه یہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دوسری مستقل بالذات تحریکات کے منہ آ سکے اور غور و فکر کا ہدف ہو سکے۔ ورنہ یہ خیال کیا جائے گا کہ انگریز نے متحده ہندوستان میں اپنی حکومت کو قائم رکھنے کیلئے جو جتن کیا ہے اور جس طرح بیسوں فتنے اٹھائے ہیں ان میں ایک جتن اور فتنہ یہ بھی ہے“ ممکن ہے لوگوں کا ذہن اس حقیقت کی طرف متوجہ نہ ہوتا اور یہ الزام الزام ہی رہتا کہ مرازائیت کی پوادا انگریز کی لگائی ہوئی ہے۔ وہ تو مراز اصاحب نے خود لکار لکار کر اور پکار پکار کر کہا کہ تم نے انگریز کی تعریف میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ انہیں اگر الماریوں میں ترتیب سے رکھا جائے تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔ میں نے اس امر کی صراحةً بھی کر دی کہ احمدیت انگریز ہی کا خود کاشتہ پودا ہے۔

اس اعتراض کی تردید کی ضرورت دراصل اس لئے پیدا ہوئی کہ یہاں ایک انگریز کو یہاں سے جانا پڑا اور اہل وطن کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ انگریزی مصالح نے اپنے قیام کو حق بجانب ٹھہرانے کیلئے چال اور دیس سے کاری کی کن کن عجیب و غریب صورتوں کو پیدا کر رکھا تھا۔ آزادی کے اس دور میں احساسات نے ایک نئی کروٹ لی ہے اور نقد و نظر نے گزشتہ واقعات کا اس طرح جائزہ لینا شروع کیا ہے کہ متحده ہندوستان میں مرازائیت کو کیوں نوازا گیا۔ اور حکومت کی چشم التفات خصوصیت سے اس نوع کے فتنوں کی جانب کیوں ملقت رہی۔ میاں صاحب چونکہ بہت ذہین اور ہوشیار نہ ہبی لیڈر ہیں اس لئے حالات کی اس تبدیلی سے واقف ہیں اور ان کی ہدایت کے مطابق عام مرزاں ای علماء تک ودوں میں ہیں کہ کسی طرح مرازائیت کی ایسی نئی تعبیر کی

جائے اور اسکے تاریخی چوکھوں کو اس انداز سے بدلا جائے کہ یہ بدرجہ آخ رگوارا ہو سکے اور اس لائق ہو سکے کہ لوگ اس کا نام من کر غور و فکر کیلئے کچھر کیس ھمارت و نفترت سے منہ نہ پھیر لیں۔

میاں صاحب کو ایسا کرنے کا حق ہے۔ جھوٹ اور باطل کی کوئی ترجمانی اس ڈھنگ کی نہیں ہو سکتی جو اس کو حق و صحت سے بدل دے۔ اس صحبت میں ہمیں اس سے بحث نہیں کرنا ہے کہ مژاہیت فی الواقع انگریز کے اشارہ چشم وابرو سے معرض وجود میں آئی یا مخالفین کا یہ اعتراض تعصباً پرمی ہے۔ چونکہ یہ بحث بہت پرانی ہے اور مژاہی خوب جانتے ہیں کہ نے اس پر اب تک جو اعتراضات کے ہیں ان میں ایک بھی پیش پا افتدہ نہیں۔ ہم جدت کے قائل ہیں، ہم یہ نہیں چاہتے کہ قارئین کرام کو باسی بھوروں پر ٹرخائیں۔ یہ اعتراض بجائے خود صحیح ہو یا ناط اتنا بغیر ادنیٰ اختلاف کے کہا جا سکتا ہے کہ مژاہیت سے متعلق یہ گمان کہ اس نے انگریز کی خوشامد اور تمسل پر مشتمل کلمات کا اظہار کیا ہے اس کی گزشتہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس کی مصالح ہمیشہ انگریز کی مصالح کے تابع رہی ہیں۔ ہم اس حقیقت پر صرف اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ یہ ایک الزام اور اعتراض ہے جو بارہا نوک قلم پر اور زبان پر آچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب کو اس سالانہ جلسہ پر اس کی تردید کرنا پڑی۔

ہمارے نزدیک جس طرح نبوت کی ایجابی پہلو ہیں اسی طرح اس کے سلیٰ پہلو بھی ہیں۔ یعنی جس طرح نبوت کے کچھ ثابت لوازم ہیں اس کے ثابت متعلقات ہیں جو تمام انبیاء علیہ السلام میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو انبیاء علیہ السلام میں بالاتفاق نہیں پائی جاتیں۔ آپ اگر انبیاء علیہ السلام کی تاریخ اور ان کے احوال پر غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت آپ منشف ہو گی کہ ان سبھی چیزوں

میں ایک اہم یہ بھی ہے کہ ان پر کبھی اس قسم کا الزام نہیں لگایا جاتا کہ وہ ایک ظالم و غاصب حکومت کی تعریف میں رطب المسان ہیں۔ کیونکہ مجردار شہر پر کہ عدل اور انصاف کا سب سے بڑا نمونہ اور حق و صداقت کا ظہور اتم جور و تم کے سب سے بڑے پیکر کے سامنے سجدہ کنا ہے ان کو پایہ اعتبار سے ساقط کر دیتا ہے۔ انبیاء کے حق میں اس طرح کا الزام بعینہ اس طرح کا ہے کہ ہم کہیں کہ فلاں نجح بہت قابل ہے لیکن بد دیانت ہے یا فلاں عورت پاکدامن ہے لیکن کئی مردوں سے دوستی بھی ہے یا یہ کہ کوئی شخص بہت شریف ہے۔ اگرچہ شراب اور جوئے کا بھی عادی ہے۔ یہ تمام دعوے اس قبیل کے ہیں جن کا ایک جزو دوسرا چیزوں کی نفی کر رہا ہے کیونکہ نجح کیلئے دیانت شرعاً اول ہے اور جو کچھ بھی ہو نجح نہیں ہو سکتا۔ پاکدامنی عفاف کی مقتضی ہے اور شرافت کا یہ معنی ہے کہ ان لغویات سے کلی احتراز ہو۔ انبیاء جب ایسے ماحول میں آئیں جب ان کے سامنے ایک ظالم و غاصب گورنمنٹ موجود ہو تو ان کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ کریں۔ ان کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ ان کی دعوت غلط ہے، یہ اعتراض ہو سکے گا کہ یہ اپنا اقتدار چاہتے ہیں انہیں کچھ لوگ جادو گر بھی کہیں گے۔ جھٹلانے والوں کی بھی کمی نہیں ہوگی، لیکن ایسے لوگ بالکل نہیں ہوں گے۔ جوان پر یہ الزام لگائیں کہ جور و استبداد کے جس ایوان کو یہ گرانے آئے ہیں اسی کی تعمیر میں کوشش ہیں۔ موئی فرعون سے اور ابراہیم نمرود یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے آپ کی تعریف میں کوئی تصدیہ لکھا ہے۔ ان کے متعلق کوئی دوسرا شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اپنی عمر میں ان سے تعاون کیا۔ حضرت یوسفؑ کی مثال سے غلط استدلال نہ کیا جائے۔ ہمارے اعتراض کی نوعیت یہ ہے کہ حکومت ظالم ہے اور اسکو بد لے بغیر کاروبار نبوت کی تکمیل نہ ہو سکتی ہو۔ اس صورت میں انبیاء کے منصب کا اولین تقاضا یہ

ہوتا ہے کہ اس کو ختم کیا جائے اور ایسی آب و ہوا مہیا کی جائے جس میں ایمان کا شجر طوبی پنپ سکے۔

ہمارے اعتراض سے بچاؤ کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ فرض کیا جائے کہ انگریز کی حکومت عدل و انصاف کی حکومت تھی اور ہمارے فکر و عمل پر اس طرح اثر انداز نہیں تھی کہ اس کا ہٹانا ضروری ہو، اور یا یہ مانا جائے کہ مرزა صاحب کی نبوت نبوت نہیں تھی محض ایک ڈھونگ تھا جو رچایا گیا تیری کوئی صورت نہیں فاخترا ہوانہما!

شیطان سے دستی اور اس کے چیلوں چانٹوں سے دشمنی

الفضل کے مدیر مولوی روشن دین تنور پر آج کل مولانا مودودی اور خاکسار ندوی سے متعلق اس ڈھب سے لکھ رہے ہیں کہ گویا مزائیت کے سلسلہ نفاق کے یہی دو بڑے دشمن ہیں۔ حالانکہ اس بد ذوقی کے سب سے بڑے دشمن ہم دونوں نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہیں۔ جن کے دین سے مرزائیوں نے روگردانی اختیار کر رکھی ہے۔ یا پھر عقل سلیم اور فہم صحیح ہے جس سے ان کو کوئی حصہ نہیں ملا۔

گزشہ اور اق میں ہم لکھ چکے ہیں کہ مرزائی اکابر انگریز پرستی کے روایتی داع غ کو اب دھونا چاہتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ محض ایک تبلیغی فرقہ ہیں۔ انگریز کا خود کاشتہ پودا یا ان کے عہد فتنہ پرور کی یاد گار ہرگز نہیں۔ اس کے ثبوت میں ان کا یہ کہنا ہے کہ اگر ہماری جفا کشی و فادری کے افسانوں میں کوئی سچائی ہوتی تو ہم پادریوں کو دجال کیوں کہتے۔ جب ہم نے کھلے بندوں نہیں دجال ٹھہرا�ا ہے۔ ان سے بھیشیں کی ہیں اور ان کے مطاعن کا جواب لکھا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز کی خیمه برداری کا قصہ جھوٹا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اسی عقل کو منصف قرار دیتے ہیں جس

سے قادیانی امت محروم ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ قادیانیوں نے انگریز کی خوشامد اس لئے گوارا کی کہ اس کی وجہ سے اس فتنہ کو پھیلنے اور پنپنے کا موقع ملا، اس لئے اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کی تاکہ اس کے بل بوتے پر مسلمانوں کو جی بھر کے گالیاں دی جاسکیں اور پادری کو اس لئے دجال ٹھہرا یا کہ اس طرح نبوت کا کاروبار چمکتا تھا۔

میز ایسا کرنے میں ضرور آزمائش کا بھی کوئی اندیشہ نہ تھا۔

یعنی مرزا صاحب خوب سمجھتے تھے کہ انگریز کی مخالفت میں ذرا بھی قلم کو جب شدی تو ساری سلطانی ”دھری رہ جائے گی“ اور مفت میں جیل خانے کی ہوا کھانی پڑے گی۔ بخلاف اس کے پادری کے خلاف کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بالکل نہتھا ہے اس کے ہاتھ میں اگر کوئی ہے تو وہ بے جان بائیکیل ہے اور ظاہر ہے کہ خطروہ اس ہاتھ سے نہیں ہے جس ہاتھ میں بائیکیل ہے بلکہ خطرناک وہ ہاتھ ہے جس میں سطوت و اقتدار کی باغ ڈور ہے۔ ان دونوں ہاتھوں میں جو کھلا ہوا فرق ہے مرزا صاحب اس کو کسی حد تک پہچانتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ مرزا صاحب جو مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت سخت ضدی تھے مسٹر ڈولی کی عدالت میں قانون کی ایک ہی نگاہ غضب سے ڈر کر یہ لکھ کر دے آتے ہیں کہ وعدیدی پیشگوئیاں میں آئندہ شائع نہیں کروں گا۔ کیونکہ ایک فریق کا اس سلسلہ میں یہ بجا اعتراض تھا کہ جب کسی کی موت کی خبراً اتے ہیں تو اس کی تحقیق و تقدیق کے لئے خود انہیں زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔

حق گوئی کا تقاضا یہ تھا کہ مرزا اس پھر سے دست و گریاں ہونے کے بجائے جو کسی شریف انسان کی طرف پھینکا جاتا ہے اس ہاتھ کو کوستے جس سے وہ پھر پھینکا ہے۔ اس پیش پا افتادہ حقیقت سے کون نا آشنا ہے کہ پادری کو سمجھنے والا اور اسلام کے خلاف بد گوئی کرنے پر اس کی حوصلہ افزائی کرنے والا انگریز تھا۔ اسی نے

اس گروہ کو متعدد ہندوستان میں دل آزار تنقید کی محلی چھٹی دے رکھی تھی تاکہ مسلمانوں میں اس طرح دینی عصبیت اور اسلامی محیت و غیرت کے تقاضے آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے جائیں اور اس کو بغیر کسی کھنکے کے حکومت کرنے کا موقع ملے۔ جن لوگوں کا تھوڑا سا بھی مطالعہ ہے اور جن لوگوں نے اس لشی پر پرسسری نظر بھی ڈالی ہے جو عیسائی مشنریوں نے پیش کیا وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی ذات کو خصوصیت سے ہدفِ مطاعن ٹھہرایا گیا ہے۔

پادری اس باریک نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے کہ مسلمان اگرچہ اسلام کی ان خوبیوں سے محروم ہو چکا ہے جن کا تعلق صاف ستری معاشرت سے ہے۔ مذہب کے اس تصور سے بے گانہ ہو چکا ہے جو روزمرہ کی عملی زندگی کی تعبیر ہے اور اس حقیقت سے بے بہرہ ہو چکا ہے کہ سیاسی تغلب کے بغیر مذہب اکثر اپنی دلکشی کھو بیٹھتا ہے اور بجائے اس کے کہ پوری انسانیت کی فلاج و بہبود کا موجب ہو سکے صرف انفرادی معاملہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تاہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کے قلبی روابط کا اب بھی جو عالم ہے وہ اس نوعیت کا ہے کہ اگر یہ لگاؤ تازہ ہو جائے تو پورے مذہب کے زندہ ہو جانے کے امکانات پھر سے ابھر آتے ہیں۔ اس لئے یہ لازم آتا ہے کہ اس تعلق کو ٹھیس لگانے کے لئے پادریوں کی لام ڈوری مقرر کی جائے جو ایسی زہریلی کتابیں لکھیں اور ایسی ایسی گستاخیاں کریں جن سے یہ جذبہ مجرور ہوتا ہو۔ یہ خالص استعماری حرਬہ تھا جو استعمال کیا گیا۔ اس کا علاج یہ تھا کہ ایک طرف تو ان اعتراضات کا محققانہ جواب دیا جاتا۔ دوسری جانب روزہ مرہ کی زندگی میں جونقاں پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کا پروگرام بنایا جاتا اور ان کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس انگریز سے نکر لی جاتی جس کی شہ اور ایماء سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

چنانچہ اہل حق نے یہی کیا۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک پر بلند پایہ
ستا میں لکھیں۔ زندگی کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا اور ان کی اصلاح کیلئے مختلف تعلیمی
و اصلاحی اداروں کی بنیاد رکھی اور انگریز کے خلاف سینہ پر ہوئے تا آنکہ پچاس سال
سال کی حجہدانہ سرگرمیاں رنگ لائیں اور انگریز ہندوستان اور پاکستان سے یک بنی و
دو گوش رخصت ہوا۔

اس کے مقابلہ میں مرزا صاحب کا یہ کارنامہ کتنا شرمناک ہے کہ انہوں نے
انگریز کی درازی عمری کی دعائیں مانگیں۔ اس کی تعریف میں اتنا کچھ لکھا کہ پچاس
الماڑیاں بھر جائیں۔ اسے اپنی تلوار بھرایا، اس کی وفادای کو مذہبی عقیدہ قرار دیا۔
بغداد کی فتح پر چراغاں کیا اور خوشی کے شادیاں بجائے۔ کیا پادری کو دجال کہہ دینا
اتنا برا کمال تھا کہ اس کے بعد یہ تمام حرکات جائز ہو جاتی ہیں۔

مزہ جب تھا کہ اس انگریز کو دجال کہا ہوتا جس نے اپنی استعمار کی گاڑی کے
آگے ان پادریوں کو جوتا، جس نے ان تبلیغی کوششوں کو اپنے حق میں استعمال کیا اور
جس نے ان کو آنحضرت ﷺ کی توہین و تحیر کی جرأت دلائی۔ یہ کہاں تک دیانت
ہے کہ شیطان سے تودو تی ہے جو شر کا اصلی منع ہے اور اس کے چیزوں چانٹوں سے
دشمنی ہے۔ اگر یہ پالیسی کار و بار بنت کو زیب دیتی ہے تو پھر افسوس ہے کہ یہ نکتہ، جاں
بر حضرت ابراہیم ﷺ کو نہ سو جھا۔ حضرت موسیٰ ﷺ کے ذہن میں نہ آیا اور نہ آگ
میں کو دنے اور فرعون سے لڑائی مول لینے کے بجائے یہ زیادہ عافیت کار استہ تھا کہ ان
کی اطاعت کا دم بھرا جاتا اور ان کے کاہنوں اور مولوی فاضلوں کو دو چار گالیاں دے
لی جاتیں۔

مرزا نیت کی معذرت

کیا انگریز کے ابليسی ہتھکنڈوں کی تائید سے اسلام کی اشاعت کا اہتمام ہو سکتا ہے؟ الفضل آج کل بہت بھپرا ہوا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں سلسلہ، مرزائیہ کا سب سے بڑا شمن سمجھے ہوئے ہے۔ خدا کرے کہ اس کا یہ گمان صحیح ہو، ہماری حالت اس کے مقابلہ میں یہ ہے کہ مرزائیت پر قلم اٹھاتے وقت ایک طرح کی شرمی محسوس ہوتی ہے۔ کونکہ فکر عمل اور عقیدہ وايمانیات کی اس بذوقی پر گزشتہ زمانے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب کوئی نیا پہلو آسانی سے نہیں سوجھتا۔

پچھلے صفحات میں ہم نے مرزائیت کی سیاسی پچھوڑ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس فتنہ کو انگریز کی مصلحتوں نے پیدا کیا اور انگریز ہی کی تائید و حمایت سے یہ پروان چڑھا اور تو اور خود مرزا صاحب آنجمانی اور مرز احمد صاحب یہی سمجھتے رہے کہ نفاق و افتراء کا یہ شجرہ خبیثہ اسی وقت تک تروتازہ رہ سکتا ہے جب تک انگریزی حکومت کا سایہ اس پر رہتا ہے۔ یہاں آزادی وطن کی تحریکیں کامیاب ہوئیں اور وطنِ عزیز نے اجنبی اقتدار سے گلوغلاصی کرائی۔ مرزائیت کا یہ پیڑ خود بخود سوکھنا اور مر جہانا شروع ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ مرزائی اکابر کو آزادی و حریت کی تحریکیں ایک آنکھ سے نہ بھائیں اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کی سخت مخالفت کی بلکہ جہاد ہی کو منسون خٹھہ رایا۔ خونی مہدی کا مذاق اڑایا بلکہ صاف صاف یہ کہنا شروع کیا کہ انگریز ہماری تواری ہے۔ اگر یہ کند ہوئی یا چھن گئی تو کامیابی نہیں ہو سکتی اور ہماری اس تحریک کا طبعی طور پر دامن نفاق انگلیزی سے وابستہ ہے۔ یہ دامن اگر بد قسمتی سے سما تو مرزائیت کا پھیلاو بھی لامحالہ سنتے گا۔ لہذا اس کی تائید و نصرت ہمارا دینی فرض ہے، اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ذلیل قسم کی خوشامد بھی کی یعنی اس ذلت کو بھی گوارا

کیا کہ مرزائیت انگریز کا خود کاشتہ پودا قرار پائے اور حمیت و غیرت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے متحده ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے زخموں پر یہ کہہ کر نمک چھڑکا کہ تم ایک بغداد کے سقط پر روتے ہو ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا پر انگریزی پر چم لہرائے۔ اس سے قبل، ہم اس نوع کے تمام حوالوں کا ذکر کر چکے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزائیت کے سیاسی حرکات کیا ہیں؟ یہاں ان کو دہرانہیں چاہتے ہے صرف اس کے جوابات پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ افضل کا کہنا ہے کہ مرزائیت نے حکومت باطلہ کی تائید نہیں کی بلکہ عین اس وقت جب انگریزی اقتدار کے حلقوں پھیل رہے تھے دلوں اور طبیعتوں پر افسردگی طاری تھی مرزائیت نے تبلیغ کا مرہم مہیا کیا اور ان لمحوں کو ”انگریز کی سیاسی مخالفت میں ضائع کئے بغیر“ اشاعتِ اسلام کیلئے مفتعم جانا اور ایسا تبلیغ کا رسمہ انجام دیا جو علماء نہیں انجام دے سکتے تھے۔ میاں محمود اور افضل نے اس کے علاوہ یہ بھی کہی ہے کہ مرزائیت اگر انگریز کی تائید کرتی تو اس کے خدا کی موت کا اعلان کس طرح اس کو زیب دیتا اور اسے کیونکر جرأت ہو پاتی کہ کھلے بندوں پادریوں کو دجال ٹھہرائے۔

ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ مذہبی تبلیغ کے معنی اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہیں کہ پورے اسلامی نظام کی تبلیغ ہو۔ اس میں عقائد بھی ہیں، عبادات کی تفصیل بھی ہے اور سیاست کا مذکور بھی۔ وہ لوگ جنہوں نے اسلامی نظام حیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کو دوسرے مذاہب سے میتیز اور جدا قرار دینے والی ایک ہی چیز تو ہے کہ اس میں زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ یہاں اگر پھر کے بتوں کو توڑا گیا ہے تو ان برخود غلط خداوں کے ظلم، استبداد، کوئی پاش پا ش کیا گیا ہے۔ جن کی وجہ سے انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ تبلیغ یہ نہیں کہ انگریز کی

سیاسی قوت تو بڑھائی جائے اس کے اقتدار و سطوت کے دائروں کو بغیر روک ٹوک پھیلنے دیا جائے۔ بے وقوفی یا مکاری سے اس کیلئے دینی سہارے بھی مہیا کئے جائیں اور پھر یہ سمجھا جائے کہ اسلام (جو میں اس کی ضد ہے) کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔

کیا عفو نت کے پھیلانے سے عطر کی مہک میں اضافہ ہوتا ہے۔ سوم آب و ہوا میں زندگی کی کوئی رمق باقی رہتی ہے؟ جھوٹ اور کذب کی اشاعت سے سچائی کی تبلیغ کے موقع میسر آتے ہیں۔ اگر جواب یہ ہے کہ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا تو پھر بتایا جائے کہ شیطانیت کے استحکام سے نبوت کا کارخانہ کیونکر چل سکتا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ مرزا نیت کا تصور دنیا اور دین دونوں سے متعلق سخت ناقص اور گھٹیا ہے، دین کا تصور ان کے نزد یک یہ ہے کہ یہ صرف بحث و مناظرہ کی آزادی سے تعبیر ہے۔ اگر چند مسائل پر کتابیں لکھی اور تپھی جا سکتی ہیں اور مناظرہ و بحث کا میدان گرم کیا جا سکتا ہے تو یہ اسلام کی بہت خوش بختی ہے۔ اسی طرح ریاست اور شیعیت کی ہم گیری اور زندگی کے ہر ہر خانہ میں اس کی دخل اندازی ان کی نظروں سے او جھل ہے۔

یہ سمجھتے رہے کہ انگریز کی گرفت اگرچہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے۔ تعلیم و اشاعت کے ذرائع پر بدستور اس کا قبضہ رہے اور ذہنوں کو خالص استعاری سانچوں میں ڈھانلنے کی آزادی پر بھی کوئی قدغن نہ ہوتا بھی اسلام کے بڑھنے اور پہنچنے کے واقعہ اور احتمالات قائم رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص طاعون اور ہیپسے کے مہلکات کو دعوت دے کر زندگی کی بچی کچی رفتار سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے تو یہ بھی ناممکن تھا کہ انگریز کی تائید کر کے اسلام کے لئے کسی بھلائی کی توقع کی جاتی۔ بلکہ اگر آپ اسلام کی جامعیت سے واقف ہیں اور اس کے موجودہ دوازدہ بھی سمجھتے ہیں تب دیانتداری سے آپ کی یہ رائے ہو گی کہ غلط اور غیر دینی حکومت و اقتدار پر چوٹ لگائے بغیر یہ ناممکن

ہے کہ صحیح اسلامی اقدار کی اشاعت ہو سکے۔

باتی رہا آپ کا یہ کہنا کہ اگر ہم انگریز کے اتنے ہی خیرخواہ ہوتے تو مسح کی وفات کا کیوں اعلان کرتے اور پادریوں کو کیوں دجال کہتے تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ بھی مرازائیت کے مجملہ متناقضات میں سے ہے۔ کیونکہ یہ تو بہرآئندہ واقعہ ہے کہ آپ لوگوں نے انگریز کی وفاداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اب یہ آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ مسح کی موت کا کیوں اعلان کریں جبکہ مسح کے ماننے والوں سے دوستی کا رشتہ استوار ہو رہا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر مسح کا انتقال ثابت نہ ہوتا تو مراز صاحب کیونکر نبوت کا ڈھونگ رچاتے۔ انہوں نے اگر یہ کیا ہے تو مخالفت کی بناء پر نہیں بلکہ خود غرضی کے داعیہ سے متاثر ہو کر۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ انگریز ہرگز ان معنوں میں عیسائی قوم نہیں ہے کہ ان میں مذہبی روح کا فرماء ہے۔ وہ تو عیسائی صرف ان معنوں میں ہیں کہ قومیت کی تغیری میں اس عامل سے فی الجملہ ان کو مدعاً تھی ہے ورنہ عیسائی عقائد و فروعات کی تردید میں خود انگریزوں نے جتنا کچھ لکھا ہے مرازا صاحب نے تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا۔

جعل سازوں کی خاص تکنیک

جس طرح تندری اور بیماری میں ایک بین فرق ہے تو انا تو تنومند انسان قد و قامت سے، دم خم سے، چہرے اور بشرے کی رنگت اور بثاشت سے اور لب و لبھ کی تازگی اور زور سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں بیمار و لا غر آدمی کی ہر ہر ادا میں ضعف و دودماندگی کی جھلک ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا جسم اس کی چال اور اس کی بات چیت تک میں ایک طرح کی لرزش اور کمزوری ضروری آ جاتی ہے اور بغیر کسی وقت نظر اور حذاقت کے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مرض نے اس پر بری طرح قبضہ

کر رکھا ہے۔ اسی طرح دل کے روگ اور دل کی بیماری کے بھی کچھ ایسے واضح اور کھلے ہوئے علام ہیں کہ ایک عامی بھی معلوم کر سکتا ہے کہ اس پر شک و تذبذب کا کس درجہ دباو ہے اور کذب و افتراء نے کیونکہ اس سے اطمینان اور چیزیں چھین رکھا ہے۔

جو ٹوٹے اور چھپے آدمی میں ایک بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ جہاں صداقت اور سچائی سے بہرہ مندا انسان بھاری بھر کم پن سے کام لیتا ہے وہاں جھوٹا اور کاذب انسان بات بات پر چھلک چھلک جاتا ہے۔ وہ چونکہ کھوکھلا ہوتا ہے اور بری طرح سے محسوس کرتا ہے کہ دل میں جھوٹ کا کھوٹ موجود ہے اس لئے خلا کو بھرنے اور کھوکھلے پن کو دور کرنے کے لئے غیر ضروری تائید اور توثیق کے کلمات استعمال کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال سورہ منافقون کی پہلی آیت ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ”یہ لوگ جن کے دلوں پر ایمان کی پر چھائیں بھی نہیں پڑی ہیں جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کتنے موثق اور موکد لمحے میں اپنے اسلام کا یقین دلاتے ہیں کہ نشہد انک لرسول اللہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ یہاں یہ جان لینا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ قاعدہ کے اعتبار سے اس چھوٹے سے جملے میں منافقین نے تائید کا ذہنگ سے استعمال کیا ہے۔ ایک توقول کے بجائے شہادت کا لفظ چنا اور دوسرے ”ان“ لائے۔ اور تیسرے کلامِ تائید بڑھایا۔ جس سے غرض یہ تھی کہ کالم میں کہیں جھوٹ نہ رہ جائے اور کوئی ایسا روز نظر نہ آئے جس سے دل کے شک اور نفاق پر اطلاع ہو سکے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہی پیش بندی اور احتیاط کی ضرورت سے زیادہ یقین دہی کی کوشش اور اپنی سچائی کا ذہنڈہ و را پیٹھا ان کے کذب کی کھلی ہوئی دلیل ہو جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام جو سچائی اور صداقت کی دولت سے بہرہ مند ہوتے ہیں ان

کے کلام میں قطع نظر ان کی دعوت کی محکمی اور سیرت کی پاکیزگی کے اس انداز کی کوشش نہیں ہوتی جسے غیر منطقی یقین دہی اور غیر ضروری تشبیہ سے تعبیر کیا جاسکے۔ یہ یقیناً دعاویٰ بھی پیش کرتے ہیں۔ اور ان دعاویٰ کے ثبوت میں دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہو پاتا کہ خدا نخواستہ یقین و اذعان کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ ان کے کلام میں بڑی سنجیدگی ہوتی ہے۔ ایک طرح کا بھاری بھر کم پن ہوتا ہے اور گہراً ہوتی ہے۔ بخلاف ایک جھوٹے اور جعل ساز کے وہ تبلیغ و اشاعت کے لئے ایسے ذہب اختیار کرتا ہے جن میں اتنی یقین و ایمان کی جھلک نہیں ہوتی جس قدر یقین دہی کی غیر منطقی اور غیر کوششوں کی۔

یوں سمجھ لیجئے کہ سچانبی اس کامیاب تاجر کی طرح ہے جس کے گودام مال سے بھرے پڑے ہیں اور جس کی دکانیں اجنبی تجارت سے اس درجہ مالا مال ہیں کہ گاہک کو متاثر کرنے کیلئے اس کو غیر تاجرانہ تھکنڈوں کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور جھوٹا نبی اس دیوالئے اور کھلکھلی مانند ہے جس کے گودام خالی اور دکانیں سامان تجارت سے تھی ہیں۔ یہ گاہک کو پھانسے اور دھوکہ دینے کیلئے مجبور ہو گا کہ غیر ضروری شفاقت کا اظہار کرے اور بازاری یا اشتہاری طریق سے کام لے۔ یعنی جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ یہ سونا ہے جسے میں بیچتا ہوں تو اس کے دل میں چونکہ جھوٹ کی کوئی خلش نہیں ہوتی اس لئے اس کا جھگڑا زیادہ تر مول تول پر ہوتا ہے اور جو ملجم کو سونا بنا کر بیچنا چاہتا ہے وہ بھاؤ اور قیمت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا جتنا اس بات کو کہ ملجم کے بارے میں گاہک کے شک و تذبذب کو دور کیا جاسکے۔ وہ بار بار اس انداز کے جملے استعمال کرے گا کہ جناب یہ خالص سونا ہے۔ اگر یہ کھوٹا ثابت ہو جائے تو میں اتنا انعام دوں گا اتنے ہر جانے کا مستحق ٹھروں گا اور یہ میری سزا ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ غیرہ۔

ضروری تائید اور غیر منطقی یقین دہی اکثر جھوٹ پر دلالت کرتی ہے۔ یہ نفیات کا موتا اور مانا ہوا اصول ہے۔ مرزا صاحب کی تحریرات کا اس کسوٹی پر جائزہ لیجئے گا تو معلوم ہو گا کہ ان کے دل کے روگ اور کھوکھلے پن نے ایسے ہتھکنڈوں کا بلا مجاہبا استعمال کیا ہے۔ ان ہتھکنڈوں میں سے ایک معروف ہتھکنڈا انعامی اشتہارات کا ہے جن کا مرزا صاحب نے بڑا پروپیگنڈا کیا ہے۔ حالانکہ یہ یمنیک خاص جعل سازوں، مداریوں اور شعبدہ طرازوں کی ہے کہ وہ بات بات پر شرط بدلتے اور انعام مقرر کرتے ہیں ورنہ کوئی سنجیدہ اور ذی علم آدمی انعام بازی کی اس غیر معقول روشن کا مرتكب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دلائل میں جو نقش ہے اسے انعام بازی کے اعلانوں سے دور کرنا مقصود ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مرزا صاحب کا یہ اندماز ہمارے بعض مناظرہ باز علماء نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ حد درجہ معیوب اور پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی بات ہے۔

نبوت سے دست برداری

سچائی جب اذعان و آگئی کے جھروکوں سے کسی کے دل پر اپنا پرتو ڈالتی ہے تو خوف و ہراس کے تاریک بادل یک قلم چھٹ جاتے ہیں اور ایک دم اطمینان و تسلیم سے دل یوں بھر جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے بلائے ہوئے جادوگروں میں مقابلہ ہوتا ہے جادوگر یہ کرشمہ دکھاتے ہیں کہ رسیاں اور لاٹھیاں ہو بھو سانپ معلوم ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا جاتا ہے کہ گھبراو نہیں تم ہی سرپلند رہو گے لاثھی باتھ سے پھینکو، جادوگر یہ دیکھ کر کہ وہی لاثھی ایک اڑدھا کی صورت میں اس کے بنے ہوئے سانپوں کو دبوچ اور نگل رہی ہے متین ہوتے

ہیں۔ پھر ان پر یہ بات سکھلتی ہے کہ جادو اور اعجاز میں جو فرق ہے وہ جھوٹ اور سچائی کا ہے، حقیقت اور شعبدہ بازی کا ہے اور موسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کا نبی ہے جادو گر ہرگز نہیں۔ یہیں سے سچائی کی کار فرمائیاں ظاہر ہوتی ہیں، دل استنے مضبوط اور بے خوف ہو جاتے ہیں کہ ابھی ابھی چند لمحے پہلے جو جادو گر فرعون کی عزت و اقبال کی دعائیں مانگ رہے تھے اور اس کے دبدبہ و رعب سے لرز رہے تھے اب صاف صاف اس کے سامنے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے رب کو پہچان لیا

امنا بر رب ہارون و موسیٰ (طہ ۷۰)

فرعون دھمکی دیتا ہے کہ اگر تم نے یہ گستاخی کی تو میں تمہیں سخت ترین تکلیفیں پہنچاؤں گا۔ آڑے ترتیجھے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا اور سولی پر ناگ ڈوں گا۔

ولا صلب نلمٌ فِي جَذْوِ النَّحْلِ (طہ ۷۲) ان کا ایک ہی جواب ہے۔

لَنْ لَوْشَرَكَثْ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ (طہ ۷۲)
کہ جو سچائیاں دل کی گمراہیوں تک اتر چکی ہیں ان کو کیسے چھوڑ دیں،
سرزا کا تمہیں اختیار ہے زیادہ سے زیادہ یہی ہو گانا کہ مر جائیں گے، بلا سے،
تمہارا یہ فیصلہ زندگی تک ہی اثر انداز ہے اس کے بعد نہیں۔

فَاقْضِ مَا انتَ قاضِ انْمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحِيوَةُ
الدنيا (طہ ۷۲)

سعید بن مسیب کو گرفتار کر کے حاج کے سامنے لاایا جاتا ہے وہ پوچھتا

ہے کو تمیس کس انداز سے قتل کیا جائے گویا تمہارے جرموں کی سزا بہر آئینہ قتل ہی ہے اب تمیس جو سوچنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ قتل کی کس صورت کو پسند کرتے ہو۔ حضرت سعید نے چمک کر جواب دیا کہ جو صورت تمیس اللہ کے ہاں عذاب اور گرفت کی پسند ہے۔ اسی کے مطابق میرے ساتھ معاملہ کرو، کتنی دلیری اور بے خوبی ہے۔

اہل حق کا ہمیشہ یہی شیوه رہا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ خود حق و صداقت میں اتنی لذت ہے کہ دنیا کی ہر ہر لذت اس کے مقابلہ میں پیچ ہے۔ برونو ایک فلسفی ہے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ پہلا نظام فلکی غلط ہے۔ اس کی پاداش میں اسے موت کی سزا سننا پڑتی ہے جس کو وہ پورے استقلال سے سنتا ہے۔ پیچ بولنا اور بات ہے اور سچائی کے اظہار میں مصائب کو برداشت کرنا اور بات، پیچ کی راہ میں مصائب جھیلنے ہی سے یہ معلوم ہو سکا ہے کہ دل میں اس کے ساتھ وابستگی کا کیا عالم ہے۔ ایک عام انسان سچائی اور جھوٹ کے ساتھ کوئی اخلاقی قدر و قیمت یا حکم وابستہ نہیں کرتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اصلی شے کامیابی و کامرانی ہے اور یہ دونوں اس کے حصول کے محض مختلف ذریعے ہیں۔ کبھی سچائی سے کام نکلتا ہے اور کبھی اس کو قربان کر کے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے لیکن ایک صداقت شعار انسان سچائی کو ذریعہ و سیلہ نہیں سمجھتا بلکہ مقصد و غایت قرار دیتا ہے اور یہی پیچ اور جھوٹ انسان میں حقیقی فرق ہے کیونکہ جھوٹ انسان بھی کبھی کبھی پیچ بولتا ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلسل پیچ بولتا چلا جائے تا آنکہ اس کی راہ میں کوئی مصیبت برداشت کرنا پڑے کسی امتحان یا آزمائش سے دو چار ہونا پڑے۔

انبیاء علیهم السلام جو دنیا میں حق و صداقت کے سب سے بڑے علمبردار ہوتے ہیں ان کا معیار حق گوئی تو سب سے اوپر ہوتا ہے کیونکہ ان کا سچائی سے صرف یہ تعلق نہیں ہوتا کہ یہ امر واقعہ ہے لہذا اس کا اظہار ضروری ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ اس کے پہنچانے پر مامور ہیں۔ فاصلہ بما تشویر انہیں اس کی ہرگز پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے، حکومت کیا خیال کرے گی اور قانون و سزا کے حلقوں کیونکہ حرکت میں آئیں گے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ کے حکم کو اس کے بندوں تک پہنچانا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کو دیکھتے کہ جب توحید کی سچائی نے ایک مرتبہ دل میں گھر کر لیا تو پھر آگ کے الاو میں کو دجانا پسند کیا، مگر اس سچائی سے دستبردار نہیں ہوئے۔

انبیاء علیهم السلام کی سب سے بڑی اور موئی پہچان ہی یہ ہے کہ حق کی تبلیغ میں وہ کتنے بے باک ہیں، کس درجہ حبور اور دلیر ہیں کیونکہ حق کو شی اور حق شعاری ہی کی تکمیل کا دوسرا نام تو نبوت ہے۔ اگر ایک مدعا نبوت شخص اسی حق کو چھپاتا ہے جس کے پہنچانے پر وہ مامور ہے اور اسی سچائی کے اظہار سے خائف ہے جس کی تبلیغ پر وہ خدا کی طرف سے ملکف نہ سراہایا گیا ہے تو اس مسخرے کو کون پیغمبر کہہ سکتا ہے یہ مصلحت اندیش ہو سکتا ہے، مغار پرست اور ابن الوقت ہو سکتا ہے نبی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ایک مرتب جب مرزا صاحب موت و ہلاکت کی پیشین گوئیاں بانت رہے تھے اور ازراہ نبوت خود ہی ان کی تکمیل کے سامن بھی مہیا کر رہے تھے مخالفین نے مشرذوئی کی عدالت میں مقدمہ دائز کر دیا کہ انہیں اس بلیک میلنگ سے روکا جائے۔ مرزا صاحب کو یہ معلوم ہوا تو اوسان کو بیٹھے اور خواجه کمال

دین کی موجودگی میں نبوت سے دستبردار ہو گئے۔ آپ نے اقرار کیا کہ میں آئندہ اس ڈھنگ کی کوئی پیشیں گولی شائع نہیں کروں گا جو کسی کی موت سے متعلق ہو اور تو اور مولانا محمد نسیم بیالوی مرحوم کو ایسے کلمات سے مخاطب نہیں کروں گا جن سے ان کو اذیت پہنچے۔

یعنی آپ نے اللہ میاں سے کہہ دیا کہ آئندہ ایسے الہامات نہ ڈپھیج کئے جائیں جن پر کوئی بحثیت گرفتار کرے، فرمائیے! یہ نبوت ہے! اس سے زیادہ بے یقینی اور خوف و بزدیلی کی کوئی مثال ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارے ادنیٰ رضاکار بھی غیرت و حمیت کی اتنی توبہن برداشت کر سکتے ہیں۔

